وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَى

اور جان لو کہ کوئی چیز تم فتح پا کر حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قریبیوں کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں (کے لیے)[1231] اگر تم اللہ پر ایمان لاتے ہو اور اس (پر) جو ہم نے اپنے بندہ پر حق و باطل کے فرق کرنے کے دن اتارا جس دن دو گروہوں میں مڈھ بھیڑ ہوئی۔

1231- غَنِمْتُمْ۔ غَنَمٌ کے اصل معنی [اَلْفَوْزُ بِالشَّیْءِ] یعنی کسی چیز کا حاصل کرنا۔ راغب نے لکھا ہے کہ غَنَمٌ اصل میں بکریوں کا حاصل کرنا ہے جو بذریعہ فتح ہو۔ پھر ہر ایک چیز جو فتح کر کے دشمنوں سے حاصل کی جائے یہ لفظ بولا گیا ہے اس کے معنی لُوٹ صحیح نہیں۔

تقسیم غنیمت:

مال غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہو۔ اللہ کے لیے ہونے سے مراد یہی ہے کہ وہ فی سبیل اللہ خرچ ہو یعنی بیت المال میں داخل ہو کر مسلمانوں کی ضروریات عامہ پر خرچ ہو اور باقی سپاہیوں وغیرہ میں تقسیم ہو یا ان کی تنخواہوں وغیرہ کے کام آئے۔ پھر ان ضروریات عامہ کی تفصیل کر دی یعنی رسول اور قریبی اور یتیم اور مسکین اور مسافر۔ کہا گیا ہے کہ ان میں برابر پانچ حصوں میں تقسیم ہو مگر یہ صحیح ثابت نہیں ہوتا۔ امام مالک کا مذہب یہی ہے کہ اس خمس کے برابر پانچ حصے کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ امام اپنی رائے کے مطابق ان اغراض پر جس طرح چاہے صرف کرے۔ خود رسول اللہ ﷺ **بقدر کفایت لے کر باقی سب ضروریات عامہ مسلمین پر خرچ** کر دیتے تھے۔ جناب پیغمبر خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کس قدر لیتے تھے یہ اس سے ظاہر ہے کہ خیبر کو فتح کر کے جب آپ واپس ہوئے اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو آپ کی دعوت ولیمہ وہی ستو اور کھجوریں وغیرہ تھیں جو لوگ اپنے اپنے گھروں سے لائے تھے۔ اور اس زمانہ میں جب آپ ملک عرب کے بادشاہ تھے آپ کے گھر کا سامان ایک کھجور کی چٹائی اور ایک پانی کی ٹھلیا تھی۔ اور بیبیوں نے جب کچھ اپنی آسودگی کے لیے مال مانگا تو حکم ہوا اگر مال دنیا چاہتی ہو تو آؤ تمہیں رخصت کر دوں اور جب آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خادمہ مانگی کہ چکی پیسنے سے تکلیف ہوتی ہے تو فرمایا کہ نماز کے بعد تینتیس تینتیس مرتبہ سُبْحٰنَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ پڑھ لیا کرو۔ آپ کے گھر میں مہینوں اس طرح گزر جاتے تھے کہ آگ نہ جلتی تھی اور صرف کھجوروں پر گزارہ کرتے تھے اور اسی خمس کے متعلق ایک حدیث میں آپ کے یہ لفظ آتے ہیں [لَیْسَ لِی ... اِلَّا خُمُسٌ وَالْخُمُسُ مَرْدُوْدٌ فِیْكُمْ] (سنن أبی داؤد، کتاب الجهاد، باب فِی الإِمَامِ یَسْتَأْثِرُ بِشَیْءٍ مِنَ الْفَیْءِ لِنَفْسِهِ، حدیث: 2757) یعنی پانچواں حصہ جو میرے لیے ہے وہ بھی تمہارے اندر ہی واپس کیا گیا ہے۔

الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۱﴾

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (1232)

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ لِّیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ وَّیَحْیٰى مَنْ حَیَّ عَنْۢ بَیِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۙ﴿۴۲﴾

جب تم ورلے کنارے پر تھے اور وہ پرلے کنارے پر اور قافلہ تم سے نیچے تھا اور اگر تم (دونوں گروہ) آپس میں قرارداد کرتے تو تم میعاد میں اختلاف کرتے۔ لیکن (ایسا ہوا) تاکہ اللہ ایک امر کا فیصلہ کر دے جو ہو کر رہنا تھا تاکہ جو ہلاک ہوتا ہے وہ کھلی دلیل سے ہلاک ہو اور جو زندہ ہوتا ہے وہ کھلی دلیل سے زندہ ہو۔ اور اللہ یقیناً سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔ (1233)

ذوی القربیٰ سے مراد نبی کریم ﷺ کے ذوی القربیٰ ہی لیے گئے ہیں مگر اس سے مراد بھی یہ نہیں کہ ان کے اغنیاء کو دیا جائے بلکہ جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ حق صرف اس قدر تھا کہ ان میں سے جو غربا ہوں ان کو دیا جائے اور ان کی بیوہ کا نکاح کر دیا جائے اور کسی کو جس کے پاس خدمت گار نہ ہو خادم دے دیا جائے۔ اور ان کے خاص ذکر کی وجہ سے کہ بیت المال میں جو صدقات آتے تھے وہ ان پر حرام کیے گئے تھے اور صرف اسی مال میں سے ان کو دینا جائز تھا بلکہ یہاں ذوی القربیٰ سے مراد قرب نصرت لیا گیا ہے نہ قرب قرابت۔ یعنی ان کو دینا ان کی نصرت کی وجہ سے تھا جو وہ دین کی نصرت کرتے تھے نہ ان کی قرابت کی خاطر۔

1232 - ﴿یَوْمَ الْفُرْقَانِ﴾ یوم بدر ہی ہے۔ کیونکہ حق و باطل میں فرق کر دیا جیسا کہ مجاہد و دیگر مفسرین سے مروی ہے اور جیسا کہ ﴿یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ﴾ سے بھی ظاہر ہے۔ اس دن کیا اتارا تھا۔ وہ ساری باتیں جو حق و باطل میں فرق کا موجب ہوئیں۔ یعنی نشانات الٰہی، نصرت الٰہی، فرشتے وغیرہ۔

1233 - الْعُدْوَةِ۔ عَدُوٌّ بمعنی تجاوز سے ہے اور عُدْوَةٌ وادی کے کنارے کو کہتے ہیں۔

دُنْیَا۔ اَدْنٰی کی تانیث ہے اور قریب سے مراد مدینہ سے قرب ہے۔

قُصْوٰی۔ اَقْصٰی کی تانیث ہے اور قَصِیّ بعید کو کہتے ہیں ﴿مَكَانًا قَصِیًّا﴾ [مریم: 22:19] ''دور چلی گئی۔'' اور ﴿الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾ [بنی إسرائیل: 1:17] ''مسجد اقصیٰ'' ﴿مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ﴾ [یٰسٓ: 20:36، القصص: 20:28] ''شہر کے پرلی طرف سے۔'' اور یہاں مراد مدینہ کی جانب سے دور کا کنارہ ہے۔

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَ
جب اللہ نے تجھے تیرے خواب میں انہیں تھوڑا دکھایا اور

لَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَ
اگر وہ تجھے ان کو بہت دکھاتا تو تم ہمت ہار دیتے اور تم

لَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ
معاملہ میں جھگڑنے لگتے، لیکن اللہ نے بچالیا۔ وہ سینوں کی

اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾
باتوں کو جاننے والا ہے۔[1234]

وَ اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ
اور جب تم ایک دوسرے کے سامنے آئے تو تمہاری

الرَّكْبُ۔ قافلہ جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آ رہا تھا۔ رَاكِبٌ کی جمع ہے۔

اَسْفَلَ۔ نیچے یعنی ساحل سمندر کی طرف۔ کیونکہ وہ زمین نیچی تھی۔

﴿اخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ﴾ ضمیر مسلمانوں کی طرف ہے۔ یعنی جنگ اگر کسی وعدہ کا نتیجہ ہوتا تو ضرور تھا کہ مسلمان وعدہ پورا کرنے سے رہ جاتے اس لیے کہ کفار کی طاقت کا پتہ ہوتا اور اپنے آپ کو ان کے مقابل میں کمزور خیال کر کے مقابلہ کے لیے نہ نکلتے۔ مگر یہ سب ایک فوری کارروائی تھی اور مسلمانوں کو کفار کی طاقت اور تعداد کا علم نہ تھا۔

مَفْعُوْلًا کے معنی کیا گیا۔ مراد یہ کہ اراہ الٰہی میں ایسا ضروری ٹھہر چکا تھا کہ ضرور تھا کہ ہو کر رہتا۔ اس میں ان پیشگوئیوں کی طرف اشارہ ہے جو جنگ بدر کے متعلق مدت پہلے سے قرآن شریف میں بیان ہو چکی تھیں اور جن میں وعدہ تھا کہ مسلمانوں اور کافروں میں مقابلہ ہو کر کفار مغلوب کیے جائیں گے۔

جنگ بدر کیوں فرقان کہلائی:

اس آیت میں اول دونوں فوجوں کی حالت بتائی ہے۔ مسلمان مدینہ کے قریب کے کنارہ کی طرف تھے اور کفار دور والے کنارہ کی طرف۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ مسلمان کفار سے پیچھے میدان جنگ میں نکلے اور مقابلہ کی غرض یہ بتائی کہ وہ پیشگوئیاں پوری ہوں جو پہلے سے ہو چکی تھیں اور نتیجہ اس کا یہ بتایا ہے کہ کوئی ایسی مضبوط دلیل صداقت اسلام پر قائم ہو کہ ہلاک ہونے والے اور مخالفت کرنے والے بھی اس کھلی دلیل کو دیکھ لیں اور زندہ ہونے والی قوم یعنی مسلمان بھی اس کھلی دلیل کو دیکھ لیں۔ گویا بدر کی فتح اس لیے فرقان نہ تھی کہ کفار کو شکست اور مسلمانوں کو فتح ہوئی بلکہ اس لیے کہ عین ان پیشگوئیوں کے مطابق یہ سب کچھ وقوع میں آیا جو مدت پہلے سے شائع شدہ تھیں جن کا علم کفار کو بھی تھا اور مسلمانوں کو بھی۔

1234- نبی کریم ﷺ کو رؤیا میں دشمن تھوڑا دکھایا گیا اس لیے کہ وہ مغلوب ہونے والا تھا اور اس میں حکمت یہ تھی کہ تا مسلمانوں کے دلوں کو قوت رہے۔

اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾ ع

نظروں میں انہیں تھوڑا کر کے دکھایا اور ان کی آنکھوں میں تم کو تھوڑا کر کے دکھایا تا کہ اللہ ایک کام کا فیصلہ کر دے جو ہو کر رہنا تھا۔ اور اللہ کی طرف ہی سب کام لوٹائے جاتے ہیں۔ (1235)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ ج

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تمہارا کسی جماعت سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تا کہ تم کامیاب ہو۔ (1236)

وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾ ج

اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم ہمت ہار دو گے اور تمہاری ہوا جاتی رہے گی اور صبر کرو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (1237)

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اتراتے ہوئے اور لوگوں کے

1235 - یہ دوسرا واقعہ ہے یعنی میدان جنگ میں جب ایک دوسرے کے سامنے آئے تو اس وقت بھی مسلمانوں کو کافر تھوڑے نظر آئے۔ صرف اپنے سے دو چند، حالانکہ تھے سہ چند تھے [دیکھو نمبر: 384]۔ اس سے بھی ان کے حوصلے بڑھے اور مسلمانوں کا کفار کی نظر میں تھوڑا ہونا تو مطابق واقعہ تھا۔

1236 - یہاں پھر مسلمانوں کو فلاح کے اسباب کی طرف متوجہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جنگ اور مقابلہ کے وقت بھی اللہ کو یاد رکھو کیونکہ اصل غرض صرف جنگ میں فتح حاصل کرنا نہیں بلکہ اصل غرض فلاح ہے یعنی زندگی کے مقصود حقیقی تک پہنچنا۔

1237 - رِيْحُكُمْ۔ رِيْحٌ کے معنی ہوا ہیں۔ مگر مفردات میں ہے کہ کبھی ریح کا لفظ بطور استعارہ غلبہ پر بولا جاتا ہے اور قتادہ سے روایت ہے کہ ریح سے مراد رِيْحُ النَّصْرِ یعنی مدد کی ہوا ہے۔ (ج) کیونکہ ہوا بھی نصرت کے خاص سامانوں میں سے ہے۔ چنانچہ جنگ احزاب میں ایک ہوا نے ہی دشمن کے ٹڈی دل لشکر کو پراگندہ کر دیا اور ان کے قدم اکھیڑ دیئے۔ بتایا ہے کہ اتفاق اور مشکلات کے مقابلہ میں ثابت قدمی یہ دو بڑے کامیابی کے راز ہیں۔

بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾

دکھاوے کے لیے اپنے گھروں سے نکلے اور وہ اللہ کی راہ سے روکتے تھے، اور اللہ اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو وہ کرتے ہیں۔ (1238)

وَ اِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَ قَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَ اللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾ ع

اور جب شیطان نے ان کو ان کے عمل خوب صورت بنا کر دکھائے اور کہا آج لوگوں میں سے کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا اور میں تمہارا حامی ہوں۔ پھر جب دونوں گروہ ایک دوسرے کے سامنے آئے الٹے پاؤں پھر گیا اور کہا میرا تم سے کچھ واسطہ نہیں، میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سزا دینے میں سخت ہے۔ (1239)

1238 - بَطَرًا بَطْرٌ کے معنی نشاط ہیں یا متکبرانہ روش۔ (ل) اور بَطَر اور طَرَبٌ قریب قریب ہیں اور وہ خفت یعنی ہلکا پن ہے جو خوشی سے پیدا ہوتا ہے۔ (غ) یا وہ کسی چیز سے کراہیت کرنا ہے حالانکہ وہ کراہیت کی مستحق نہ ہو یا نعمت کے وقت حد سے نکل جانا اور سرکشی کا طریق اختیار کرنا ﴿بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا﴾ [القصص: 58:28] ''جو اپنی روزی کے سامان میں اتراتی تھیں۔'' میں اصل ترکیب ہے [بَطِرَتْ فِيْ مَعِيْشَتِهَا] (غ)

ابوجہل اور اس کے ساتھی مکہ سے نکلے تو بڑے ساز و سامان سے نکلے اور ان کو اپنی قوت پر بڑا فخر تھا اور ان کا منشا قبائل عرب پر بھی اپنا رعب بٹھانا تھا کہ ہماری طاقت بڑی ہے۔ مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے کہ تم فاتح ہو کر بھی کبھی اس غرض کے لیے جنگ نہ کرنا اور نہ اپنی قوت پر ناز کرنا۔

1239 - جَارٌ ہمسائے کو کہتے ہیں۔ اور جَوَارٌ یا مُجَاوَرَة کے معنی دوسرے کی حفاظت میں آنا یا حفاظت میں لینا ہیں۔ اور یہاں اسی معنی میں جَارَ ہے اور [جَارَ عَنِ الطَّرِيْقِ] کے معنی ہیں رستہ سے ہٹ گیا جو بلحاظ معنی قرب ہے اور اسی سے جَوْرٌ بمعنی عدول یا ظلم ہے۔ (غ)

قریش اور بنی کنانہ میں جنگ رہا کرتی تھی اس لیے جب قریش نے مدینہ پر حملہ کیا تو ان کو یہ بھی خیال تھا کہ کہیں بنی کنانہ جنگ پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ بنی کنانہ کا سردار سراقہ بن مالک تھا اس نے ابوجہل کو یقین دلایا کہ تمہاری طاقت بڑی ہے اور ہم تمہارے ساتھ جنگ نہ کریں گے بلکہ ہم تو تمہارے حمایتی ہیں۔ مفسرین کہتے ہیں شیطان سراقہ بن مالک کنانی کی صورت

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۹﴾

جب منافق اور وہ جن کے دلوں میں بیماری تھی کہنے لگے ان لوگوں کو ان کے دین نے دھوکا دیا ہے اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (1240)

وَ لَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ۚ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۵۰﴾

اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، ان کے مونہوں اور پیٹھوں کو مارتے ہیں اور جلنے کا عذاب چکھو۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۵۱﴾

یہ اس کی سزا ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے اور کہ اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔

اختیار کر کے آیا تھا لیکن اگر سراقہ ہی آیا ہو اور اسی کو شیطان کہا ہو جیسا کہ کئی جگہ سردارانِ کفار کو شیطان یا شیاطین کہا ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ جب قریش کے پاؤں اکھڑتے دیکھے تو بھاگ گیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ سب محض شیطان کی وسوسہ اندازی ہو نہ کوئی واقعی گفتگو۔

1240 - اس رکوع میں اصل ذکر کفار کی بدعہدی اور بار بار عہد شکنی کا ہے اور فرعون کے ساتھ مثال دینے کی وجہ بھی غالباً یہی ہے کہ وہ بھی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بدعہدی کرتا تھا ﴿فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ﴾ [الاعراف: 135:7] ''پس جب ہم ان سے ایک وقت کے لیے جس کو وہ پہنچنے والے تھے عذاب اٹھا دیتے تو فوراً عہد شکنی کرتے۔'' ایسی بدعہدیاں نبی کریم ﷺ کے آخری زمانہ میں بھی بہت سی وقوع میں آئیں جیسا کہ سورۂ براءت کے شروع میں ذکر ہے۔ مگر ابتدا میں بھی حالت ایسی ہی تھی اور آنحضرت ﷺ نے کفار قریش کی دستبرد سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے کئی ایک اقوام کے ساتھ جو حالت کفر پر تھیں عہد نامے کر رکھے تھے۔ مگر جب یہ لوگ ذرا مسلمانوں میں کمزوری دیکھتے تو فوراً عہد شکنی کرتے۔ کیونکہ ان کا اصول مہذب یورپ کے اصول کی طرح پر یہ تھا کہ کمزور قوم کے ساتھ ایفائے عہد کی کوئی ضرورت نہیں۔

مسلمانوں کی کمزوری کو دیکھ کر اور بالمقابل چاروں طرف دشمنوں کو دیکھ کر منافق لوگ اور کمزور دل یہ کہتے تھے کہ مسلمان ان وعدوں پر بھروسہ کر کے اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ نے ان کو دے رکھے ہیں۔ اس کا جواب دیا ہے کہ اللہ پر بھروسہ کرنے والا دھوکا نہیں کھاتا۔ یہی لوگ غالب ہوں گے کیونکہ اللہ غالب ہے۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾

فرعون کے لوگوں کی طرح اور جو ان سے پہلے ہوئے انہوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا سو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑا۔ اللہ طاقتور سزا دینے میں سخت ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۵۳﴾

یہ اس لیے کہ اللہ کبھی کسی نعمت کو نہیں بدلتا، جو اس نے کسی قوم پر کی ہو، جب تک کہ وہ خود اپنی حالتوں کو نہ بدلیں اور کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔[1241]

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ كُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾

فرعون کے لوگوں کی طرح اور جو ان سے پہلے ہوئے انہوں نے اپنے رب کی آیتوں کو جھٹلایا سو ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا اور سب ظالم تھے۔

1241 - **قوم سے نعمت کب چھنتی ہے؟:** یعنی اللہ تعالیٰ باوجود ان کے کفر کے بھی ان سے یہ نعمتیں نہ چھینتا اگر یہ اپنی حالتوں کو خراب نہ کر ڈالتے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے

اے کریمی کہ از خزانۂ غیب — گبر و ترسا وظیفہ خورداری
دوستاں را کجا کنی محروم — تو کہ بر دشمناں نظر داری

ہاں جب قوم سے حکومت کی اہلیت چھن جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو اٹھا کر دوسری کو اس کی جگہ لے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی دی ہوئی نعمتوں کو نہیں لیتا جب تک کہ انسان خود ہی ان کو نہیں پھینکتا۔ آج مسلمانوں کے ہاتھ سے بھی سلطنت دولت کی نعمتیں تب ہی گئیں جب انہوں نے اپنے حالات کو بدل ڈالا۔ پس مقدم ضرورت اپنی حالت میں اصلاح کرنے کی ہے اور اسی کی طرف سے مسلمان غافل ہیں۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾

اللہ کے نزدیک بدترین جاندار وہ ہیں جو کافر ہوئے پھر وہ ایمان لاتے ہی نہیں۔ (1242)

اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّ هُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾

وہ جن سے تو عہد کرتا ہے پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ (خلاف ورزی عہد سے) نہیں بچتے۔ (1243)

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾

سو اگر تو ان کو جنگ میں پائے تو ان (کی عبرتناک سزا) سے ان کو منتشر کر دے جو ان کے پیچھے ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ (1244)

1242 - یعنی ایسے کافر جنہوں نے یہ ٹھان لیا ہے کہ ایمان کسی صورت میں لائیں گے ہی نہیں۔ اس لیے وہ حق کی مخالفت پر کمر بستہ رہتے ہیں جیسا کہ ان کی عہد شکنی سے ظاہر ہے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں ذکر ہے۔

1243 - یہ حالت بھی اس وقت عام تھی۔ نبی کریم ﷺ چاہتے تھے کہ ان قوموں کے ساتھ جنگ نہ ہو اس لیے آپ نے جہاں تک ہوسکتا تھا معاہدے کر لیے تھے مگر ایفائے عہد ان اقوام میں بہت کم تھا حتی کہ یہودی جو اہل کتاب تھے وہ بھی ایفائے عہد کی پروانہ کرتے تھے اور بالخصوص مسلمانوں کی کمزوری ان کو اور بھی زیادہ عہد شکنی کی طرف مائل کرتی تھی۔

اِتِّقَآء سے مراد یہاں خلاف وزی عہد سے بچنا ہی ہے۔ مفسرین نے اس آیت کے نیچے بنو قریظہ یا بعض اور قبائل یہود کا ذکر لکھا ہے۔ مگر تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے شاذ و نادر کے جن اقوام نے آنحضرت ﷺ سے معاہدات کیے تھے عموماً عہد شکنی ہی کرتی رہیں۔

1244 - شَرِّدْ۔ شَرَدَ کے معنی ہیں بھاگ گیا۔ (غ) اس لیے طَرِيْدَ۔ شَرِيْدَ اس شخص کو کہتے ہیں جو اکیلا رہ گیا ہو۔ اور تَشْرِيْدَ کے معنی نکال دینا یا پراگندہ اور منتشر کر دینا ہیں۔ مفردات میں ہے کہ [شَرَّدْتُّ بِهٖ] کے معنی ہیں اس کے ساتھ ایسا فعل کیا جس نے اس کے غیر کو بھگا دیا یعنی ایسی عبرتناک سزا جو دوسرے کو ایسا فعل کرنے سے روک دے۔

مراد یہ ہے کہ جو لوگ بار بار بدعہدیاں کرتے اور امن اٹھا دیتے ہیں ان کو اگر واقعی مسلمانوں کے خلاف جنگ میں پائے جائیں تو عبرتناک سزا دینی چاہیے تاکہ دوسرے لوگ اس قسم کی بدعہدی سے باز آئیں۔

وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ۝۵۸ ع 7 10 3

اور اگر تجھے کسی قوم سے دغابازی کا خوف ہو تو (ان کا عہد) برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے اللہ دغابازوں سے محبت نہیں کرتا۔ (1245)

وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ۝۵۹

اور جو کافر ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ وہ آگے نکل گئے وہ عاجز نہیں کر سکتے۔ (1246)

1245 - تَخَافَنَّ۔ خَوْفٌ۔ مکروہ امر کی توقع ہے جو ظنی یا معلوم علامات سے حاصل ہو جس طرح رِجاء اور طمع محبوب امر کی توقع ہے جو ظنی یا معلوم علامات سے حاصل ہو۔ اور ﴿اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا﴾ [النسآء: 35:4] ''اگر تم کو دونوں (میاں بیوی) میں باہمی دشمنی کا ڈر ہو'' میں خِفْتُمْ (یا تم ڈرو) کے معنی کیے گئے ہیں۔ عَرَفْتُمْ تم پہچان لو، گویا اصل مطلب یہ ہے کہ حالات کے جاننے کی وجہ سے تمہیں خوف ہو۔ (غ) یہی معنی تَخَافَنَّ کے یہاں ہیں۔ یعنی یہ کہ اگر حالات کی واقفیت کی وجہ سے تمہیں ڈر ہو کہ یہ قوم خیانت کرے گی۔

﴿عَلٰى سَوَآءٍ﴾ برابری کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ ان کو مشکلات کی حالت میں پا کر چھوڑ دیا جائے یا عہد کو اس صورت میں توڑ دیا جائے کہ وہ سمجھ رہے ہوں کہ عہد باقی ہے۔ فریقین کو مساوی حالت میں رکھ کر ایسی صورت میں معاہدہ سے دست برداری کر لی جائے، دوسرے فریق کو نقصان پہنچانا مدنظر نہ ہو۔

یہ اسلام کی تعلیم کا کمال ہے کہ ایک خائن قوم کے ساتھ بھی خیانت کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ یہ فرمایا کہ اگر کسی قوم کی خیانت کا علم ہو جائے تو ان کو برابری کا موقعہ دے کر معاہدہ سے دست برداری کر لی جائے۔

1246 - **کفر اسلام پر غالب نہیں آ سکتا۔** یُعْجِزُوْنَ کا مفعول ذکر نہیں کیا۔ لیکن اگلی آیت میں مسلمانوں کو خطاب کر کے اور ان کو دشمن کے مقابلہ کے لیے تیار رہنے کا حکم دے کر صاف بتا دیا کہ یہاں بھی مسلمانوں کو عاجز نہ کر سکنا ہی مراد ہے۔ آج جب مسلمان چاروں طرف سے مایوس ہیں اور بظاہر دنیا پر کفر کا غلبہ ہو رہا ہے یہ آیت کس قدر مایوس دلوں میں امید کی روشنی پیدا کر سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو چھوڑ کر اپنے دلوں کو مایوسی کا شکار کر دیا ہے۔ اگر قرآن کریم کے یہ وعدے جو ایک مرتبہ موجودہ حالت سے بڑھ کر مایوس کن حالات کے باوجود پورے ہو چکے ہیں ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے تو زندہ ایمان ان سے ایثار کے وہ کارہائے نمایاں کرا دیتا جو دنوں میں ان کی حالت بدل ڈالتے۔ خدا کی آواز اب بھی وہی یقین ہم کو دلاتی ہے۔ چنانچہ اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو آج سے کوئی چالیس سال پیشتر یہ الہام ہوا: ''بخرام کہ وقت تو نزدیک رسید و پائے محمدیاں بر منارِ بلند تر محکم افتاد۔'' مایوسی مسلمانوں کے لیے نہیں نہ اسلام کے لیے مغلوبیت ہے۔ بلکہ

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝۶۰

اور جو کچھ طاقت اور گھوڑوں کے سرحدوں پر باندھ رکھنے سے تم سے ہو سکے ان کے لیے تیار رکھو، تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوف زدہ رکھو اور ان کے سوائے اَوروں کو (بھی) جنہیں تم نہیں جانتے اللہ ان کو جانتا ہے۔ اور جو کوئی چیز تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تم کو پوری واپس دی جائے گی اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (1247)

جہاں اور جب لوگوں نے خیال کیا کہ اسلام مغلوب ہوا وہی اس کے غلبہ کا وقت تھا۔

1247 - قُوَّةٍ۔ وہ چیز جو موجب تقویت ہو۔ مثلاً جنگ میں طرح طرح کے ہتھیار۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے لکھا ہے اور قلعے جیسا کہ عکرمہ نے کہا ہے اور رمی یعنی تیر (یا بندوق یا توپ) کا چلانا، جو ایک حدیث میں مروی ہے۔ اور رمی کی تعریف احادیث میں آئی ہے اور اس کے سیکھنے کا حکم بھی احادیث میں پایا جاتا ہے۔

﴿رِّبَاطِ الْخَيْلِ﴾ رَبْط باندھنا اور رِبَاط اور مُرَابِطَةٌ کے معنی ہیں دشمن کی سرحد پر لگے رہنا۔ گویا ہر ایک نے اپنے گھوڑے تیار باندھے ہوئے ہیں اور محض حفاظت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں [اِنْتِظَارُ الصَّلٰوةِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ] پر بھی رباط بولا گیا ہے۔ (غ) پس جس طرح جہاد پر قائم رہنے اور تیار رہنے پر رباط بولا جاتا ہے اسی طرح طہارت اور نماز پر قائم رہنے پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ رباط کے ساتھ خیل کا لفظ لانے میں مزید مستعدی پر دلالت ہے۔

﴿وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ﴾ یعنی ان دشمنوں کے سوائے جو اَب تمہارے مقابل پر ہیں کچھ اور دشمن بھی ہیں جن کو تم نہیں جانتے۔ کسی نے کہا یہود بنو قریظہ، کسی نے منافق، کسی نے اہل فارس۔ اور **ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد جن ہیں۔** میرے نزدیک ایک معنی سے یہ آخری قول درست ہے۔ کیونکہ جن وہ ہیں جو نظروں سے مخفی ہوں۔ پس اسلام کے وہ دشمن جو ابھی ظاہر نہ ہوئے تھے اور پھر وہ دشمن جن کا حملہ جنّوں کی طرح وسوسہ اندازی سے ہو۔ جیسے آج کل کے عیسائی مشنری کہ ان کا حملہ اسلام پر کھلا نہیں بلکہ جن کی طرح مخفی حملہ ہے اور طرح طرح کے اعتراض کر کے وسوسہ اندازی کرتے ہیں۔ انہی کی طرف یہاں اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

اس آیت میں دشمن کے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کو دو باتوں کا حکم دیا ہے۔ ایک قوت یعنی دشمن کی مدافعت کا سامان مثلاً جنگوں میں آلات اور قلعے اور فنون جنگ سے واقفیت اور گولہ بارود اور جہاد قلمی میں وہ علمی سامان جس سے دشمن کے اعتراضات کا

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۶۱﴾

اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تُو بھی اس کی طرف جھک جا اور اللہ پر بھروسہ رکھ۔ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (1248)

وَ اِنْ یُّرِیْدُوْٓا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۲﴾ۙ

اور اگر ان کا ارادہ ہو کہ تجھے دھوکا دیں تو اللہ تجھے بس ہے۔ وہی ہے جس نے اپنی نصرت کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ تجھے قوت دی۔

مقابلہ ہو۔ اور دوسرے مستعد رہنا۔ جس کو یہاں ﴿رِبَاطِ الْخَیْلِ﴾ کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دشمن کو اتنا موقع نہیں دینا چاہیے کہ وہ سرحد سے آگے نکل سکے بلکہ اس کا مقابلہ سرحد پر کرنے کے لیے پورا تیار رہنا چاہیے۔ اگر ظاہری رنگ میں دیکھا جائے تو مسلمانوں کی سلطنتوں کی تباہی کا موجب ﴿رِبَاطِ الْخَیْلِ﴾ سے غفلت ہوئی ہے نہ صرف یہ کہ مسلمان دشمن کے مقابلہ کے لیے سرحد پر تیار نہیں رہے بلکہ انہوں نے دشمنوں کو اپنے ملک میں گھس جانے کا موقعہ خود اپنے ہاتھ سے دیا اور دشمنوں نے اندر داخل ہو کر مسلمانوں کی جڑیں کاٹ دیں۔ اب دوسرے پہلو یعنی **جہاد قلمی میں مسلمان اسی طرح غافل ہیں**۔ دشمن طرح طرح کے سامانوں سے میگزینوں اور رسالوں اور کتابوں اور لیکچروں اور تقریروں سے اور مشن قائم کر کے اسلام پر حملہ آور ہو رہا ہے، مسلمان خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور دشمن کے مقابلہ کے لیے کوئی سامان نہیں، نہ کوئی تیاری ہے۔ تیاری کا فائدہ بتایا کہ دشمن مرعوب رہے گا اور حملہ کرنے کی جرأت نہ کرے گا بلکہ صلح کی طرف مائل ہوگا۔ اسی لیے اگلی آیت میں صلح کا ذکر ہے۔ آج بعض ناواقف لوگ یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ یورپ میں تبلیغ اسلام کی ضرورت نہیں۔ جب خود گھر میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ ایک ہی سامان سے دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں اور یورپ یعنی تثلیث کے مرکز میں توحید کی آواز کا بلند ہونا ﴿رِبَاطِ الْخَیْلِ﴾ ہے جس سے دشمن پر رعب بیٹھتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو اپنا شکار سمجھے بیٹھے ہیں۔ مسلمان اگر ہمت کر کے یہ دکھا دیں کہ ان کے نزدیک خود عیسائی ان کا شکار ہیں تو دشمن کی آدھی سے زیادہ قوت ٹوٹ جاتی ہے۔

1248 - **اسلام صلح کو مقدم کرتا ہے:** کیا یہ اس مذہب کی تعلیم ہو سکتی ہے جو بہ جبر اپنے آپ کو دنیا میں پھیلانا چاہتا ہو۔ سخت ترین دشمنوں کا ذکر کر کے، ان کی غداری کا ذکر کر کے ان کے مقابلہ میں مستعد رہنے کا حکم دے کر پھر بھی فرمایا کہ اصل غرض جنگ نہیں۔ اگر صلح کی طرف دشمن مائل ہو تو تم بھی صلح کر لو بلکہ اس سے اگلی آیت میں فرمایا کہ اگر میلان صلح میں غداری کا ارادہ بھی ان کا پنہاں ہو تو بھی تم صلح کی طرف جھکو۔ رہی غداری تو اس کے مضرات سے اللہ تم کو بچا دے گا۔ اس زمانہ میں مسلمان

وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۳﴾

اور اس نے ان کے دلوں میں اُلفت ڈالی اگر تو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب خرچ کر دیتا تو ان کے دلوں میں اُلفت پیدا نہ کر سکتا لیکن اللہ نے ان میں اُلفت ڈال دی وہ غالب حکمت والا ہے۔ (1249)

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۴﴾ ع 8 6 4

اے نبی! اللہ تیرے لیے بس ہے اور (اس کے لیے) جو مومنوں میں سے تیرا پیرو ہو۔ (1250)

بادشاہتوں کو یہ زریں اصول اور بھی زیادہ مدنظر رکھنا چاہیے تھا۔ ایک طرف اپنی طاقت اور قوت کو مضبوط کریں اور اپنی پوری تیاری دکھائیں تو دوسری طرف حتی الوسع جنگ سے بچیں۔

1249 - نبی کریم ﷺ کی نصرت کے بڑے پہلو کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ مسلمانوں میں باہمی اُلفت پیدا کر دی۔ بلاشبہ کسی قوم کے دلوں میں الفت و محبت کا پیدا ہو جانا اس کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ دلوں میں محبت ہو تو ایک دوسرے پر حسن ظن ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے کام کی قدر ہوتی ہے۔ ذاتی اغراض درمیان میں نہیں آتیں۔ آج مسلمانوں کا جو کام دیکھو اس کے خلاف نظر آتا ہے۔ ذاتی رنجشیں اور کدورتیں ہیں، بدظنی ہے، ایک دوسرے کی تحقیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کام میں برکت نہیں۔

﴿ لَوْ اَنْفَقْتَ ﴾ میں بتایا کہ وہ ملک جس کی قوم قوم کے خلاف اور قبیلہ قبیلہ کے خلاف شب روز برسر پیکار رہتا تھا، جن کی دشمنی کی آگ قریب تھا کہ انہیں بھسم کر دیتی جیسا کہ فرمایا ﴿ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ ﴾ [آل عمران: 103:3] ''تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے۔'' وہ آگ یہی باہم دشمنی کی آگ تھی۔ اس قسم کی صدیوں کی خطرناک دشمن قوموں کو ملا کر ایک کر دینا ساری دنیا کے خزانے صرف کرنے سے بھی نہ ہو سکتا تھا۔ پس وہ مذہب جس نے ایسی **دشمن اقوام میں بھی الفت پیدا کر دی** وہ آج بھی دنیا کی سخت ترین دشمن قوموں میں محبت پیدا کر سکتا ہے۔ کاش مسلمان آپس میں محبت کا نمونہ دنیا کی قوموں کو دکھاتے تو دیکھتے کہ قومیں اس طرح اسلام پر فدا ہوتی ہیں جیسے پروانے چراغ پر۔

1250 - ظاہری سامانوں کی ضرورت بتا کر اور یہاں دشمن کے مقابلہ کی تیاری کو ضروری قرار دے کر فرمایا کہ یہ سب کچھ کر کے ان چیزوں پر بھروسہ نہ کرو۔ **سامان سب کرو مگر بھروسہ اللہ کی ذات پر ہی رکھو۔** نبی کو اگر یہ موحدانہ تعلیم دی تو آپ کے مومن متبعین کو بھی یہی تعلیم دی اور نبی کو اگر ان الفاظ میں بشارت دی کہ دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر است۔ تو یہی بشارت آج ہمارے لیے بھی ہے بشرطیکہ ہم متبع بنیں۔ یہی اسلامی توکل ہے جسے لوگوں نے غلطی سے یوں سمجھا ہوا ہے کہ وہ کچھ نہ کرنے کا نام ہے۔ حالانکہ

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

اے نبی! مومنوں کو جنگ کی رغبت دے۔[1251] اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوں تو وہ دوسو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے ایک سو ہو تو کافروں میں سے ایک ہزار پر غالب آئیں گے یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ سے کام نہیں لیتے۔[1252]

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ

اس وقت اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا اور وہ جانتا ہے کہ تم

یہاں زبردست سامانوں کی تیاری کی تعلیم کے بعد توکل کے لیے کہا۔

1251 - حَرِّضِ۔ حَرَضٌ اس کو کہتے ہیں جس میں کچھ بھلائی نہ ہو، جو ہلاکت کے قریب پہنچ چکا ہو ﴿حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا﴾ [یوسف: 85:12] ''یہاں تک کہ تو مرنے کے قریب ہو جائے۔'' اور تحریض کے معنی ہیں کسی چیز کو بہت اچھا کر کے دکھانا اس پر ترغیب دینے کے لیے، گویا تحریض حَرَض کا ازالہ ہے جیسے تمریض میں مرض کا ازالہ۔ (غ)

نبی کریم ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ **مومنوں کو جنگ کی ترغیب دو**۔ اور لفظ حَرِّضِ جو یہاں استعمال فرمایا ہے وہ اس غرض سے ہے کہ تا معلوم ہو کہ جنگ میں حَرَضٌ یعنی ہلاکت نہیں۔ جیسا کہ ظاہر نظر سے معلوم ہوتا تھا، یعنی جنگ میں ہلاکت نظر آتی تھی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جنگ کو پسند نہ کرتے تھے۔ دوسرا یہ امر قابل غور ہے کہ اَلْقِتَالُ سے مراد کیا ساری دنیا کے ساتھ جنگ ہے؟ نہیں بلکہ انہی دشمنوں کے مقابل پر جن کا ذکر اوپر ہو رہا ہے اور اسی قتال پر جس کی اجازت ہو چکی ہے۔ اور وہ قتال کیا ہے ﴿قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ [البقرۃ: 190:2] جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں صرف ان کے ساتھ جنگ کرو۔ وہ بھی اللہ کی راہ میں نہ انتقام کے لیے نہ بدلہ لینے کے لیے۔ ہاں دین اسلام کی حفاظت کے لیے۔

1252 - مسلمانوں کی تعداد کفار کے مقابل بہت ہی تھوڑی تھی۔ پس ان کی تسلی کے لیے فرمایا کہ تم صابر بنو۔ یعنی مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرو تو تم میں سے **ایک آدمی دس پر غالب آئے گا**۔ اس کی وجہ بتائی کہ تمہارے دشمن ایک ایسی قوم ہیں کہ وہ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ گویا اسلام مسلمانوں کے اندر وہ بہادری پیدا کرنا نہیں چاہتا، جو اندھا دھند کام کرے۔ بلکہ ایسی بہادری پیدا کرتا ہے جو فقاہت کا نتیجہ ہو یعنی انسان سوچ سمجھ کر کہ اس کی زندگی کی غرض یہ ہے۔ پھر اس اصل غرض پر اپنی زندگی کو لگائے۔ جس نے اپنی زندگی کی غرض کو نہیں سمجھا وہ اگر ایک وقت جوش کے ماتحت اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالتا بھی ہے تو پھر جان بچانے کا خیال اس کی ہمت کو کمزور بھی کر دیتا ہے۔ یہی رنگ علمی پہلو میں بھی ہے بلکہ شاید ﴿لَّا يَفْقَهُوْنَ﴾ اسی کی طرف اشارہ کرنے کو فرمایا دس عیسائی مشنری ایک مسلمان مبلغ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے کہ ان کے عقائد کی بنیاد علم اور فقاہت پر نہیں۔

فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

میں کمزوری ہے، سو اگر تم میں سے ایک سو صبر کرنے والے ہوں، دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آئیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (1253)

1253 - اس آیت کو پہلی کی ناسخ سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہاں کوئی حکم ہی نہیں جو منسوخ ہوسکتا ہو۔ بلکہ صرف ایک خبر ہے۔ ہاں ان دونوں خبروں میں کہ پہلی جگہ فرمایا کہ **مسلمان دَہ چند تعداد پر غالب آئیں گے اور یہاں فرمایا کہ دو چند تعداد پر غالب آئیں گے فرق نظر آتا ہے۔** جس کو اَلْئٰنَ کا لفظ ہی حل کرنے کے لیے کافی ہے۔ یعنی ان دونوں آیتوں میں دو مختلف حالات کا ذکر کیا ہے۔ ایک مسلمانوں کی حالت نزول آیت کے وقت جس کو ﴿فِيْكُمْ ضَعْفًا﴾ سے تعبیر کیا ہے یعنی مسلمانوں میں اس وقت کمزوری ہے اور یہ زمانہ جنگ بدر کا ہے۔ اس وقت دشمن کے مقابلہ پر مسلمانوں میں کئی قسم کی کمزوری تھی:

① اول یہ کہ طاقت کے لحاظ سے وہ سب جنگ کے قابل نہ تھے۔ ان میں بوڑھے اور بچے بھی تھے جن کو میدان جنگ میں جانا پڑتا تھا۔ ان میں کمزور اور ناتواں بھی تھے اور تعداد اس قدر تھوڑی تھی کہ بلحاظ جنگی قابلیت کے میدان جنگ میں نکلنا پڑتا تھا۔

② دوسرے یہ لوگ فنون سپہ گری سے واقف نہ تھے۔ ان کو کسی جنگ کے لیے تیار ہی نہ کیا گیا تھا۔ بلکہ یہ جنگ صرف دشمن کی زبردستی کی وجہ سے وقوع میں آئی۔

③ تیسرے یہ کہ آلاتِ حرب ان کے پاس کافی نہ تھے۔ کیونکہ جنگ یک بیک سر پر آ پڑی۔

④ چوتھے یہ کہ دیگر ضروریات جنگ مثلاً گھوڑے، باربرداری کا سامان بھی موجود نہ تھا۔

اس لیے فرمایا کہ اس وقت تو تم ابھی جنگ کے لیے تیار ہی نہیں۔ تم میں طرح طرح کی کمزوریاں ہیں باوجود ان کمزوریوں کے اگر تم صبر اختیار کرو تو پھر بھی اس قدر نصرت تم کو دی جائے گی کہ تم دو چند تعداد پر غالب آؤ گے اور پہلی آیت میں جہاں دَہ چند پر غالب آنے کی خبر دی ہے اس میں اس حالت کا ذکر ہے جب مسلمان ہر طرح سے مسلح اور تیار ہوں۔ جیسا کہ اس سے پہلے رکوع میں اس کا مفصل ذکر بھی کیا ہے کہ تم کو ہر ایک قسم کے آلاتِ حرب اور سامانِ جنگ تیار کرنا چاہیے اور فنون جنگ سے واقفیت حاصل کرنا چاہیے۔ جب تمہارے پاس یہ سب سامان ہوں تو تم دَہ چند تعداد پر غالب آؤ گے۔

ہر حالت میں یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صبر کی شرط ساتھ ہے اور اس آیت کے آخر پر بتا بھی دیا کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یعنی نصرت الٰہی صبر کرنے والوں پر نازل ہوتی ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۷﴾

ایک نبی کے لیے شایاں نہیں کہ اس کے (قبضہ میں) قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں جنگ کر کے غالب نہ آئے۔ تم دنیا کا مال چاہتے تھے اور اللہ (تمہارے لیے) آخرت کو چاہتا ہے۔ اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (1254)

1254 - اَسْرٰی۔ اَسِیْرٌ کی جمع ہے۔

یُثْخِنَ۔ ثَخِنَ کے معنی موٹا یا سخت ہوا۔ اور اَثْخَنَ کے معنی [غَلَبَ وَ قَهَرَ] جیسا کہ ابن الاعرابی کا قول لسان العرب میں منقول ہے یعنی غالب ہوا۔ ہاں [اِثْخَانَ فِی الْقَتْلِ] کے معنی بہت قتل کرنا ہیں اور عام طور پر کسی شے میں اِثْخَانَ اس میں مبالغہ اور اکثار کو کہتے ہیں مگر مطلق اِثْخَانَ کے معنی جیسا کہ دو جگہ یہ لفظ قرآن شریف میں آیا ہے غالب آنا ہی ہیں نہ خونریزی کرنا۔ چنانچہ دوسری جگہ ہے ﴿حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ﴾ [محمد: 4:47] ''یہاں تک کہ جب ان پر غالب آ جاؤ تو ان کو قید کر لو۔'' جہاں اِثْخَان کے بعد فرمایا کہ ان کو قید کر لو اور قید وہی کیے جا سکتے ہیں جن پر غلبہ حاصل ہوا ہو نہ وہ جو قتل کر دیئے گئے ہوں۔

امام احمد اور ترمذی وغیرھما کی روایات سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ **نبی کریم ﷺ نے جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق صحابہ سے مشورہ کیا** تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ رائے دی کہ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا جائے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کہ مسلمان ابھی کمزور ہیں قیدیوں کو قتل کر دیا جائے اور رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ تمہاری مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال ہے کہ انہوں نے کہا تھا ﴿وَ مَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۶﴾﴾ [ابراهيم: 36:14] اگر کوئی میری نافرمانی کرے تو تُو بخشنے والا مہربان ہے۔ یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کہ انہوں نے کہا ﴿وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾﴾ [المآئدة: 118:5] ''اور اگر تو ان کی حفاظت کرے تو تُو ہی غالب حکمت والا ہے۔'' اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ تیری مثال نوح علیہ السلام کی مثال ہے۔ جنہوں نے کہا ﴿لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾﴾ [نوح: 26:71] ''زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑیو۔'' یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جنہوں نے کہا ﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ﴾ [يونس: 88:10] ''اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو برباد کر دے۔'' اور عمل آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے پر کیا اور یہ آیت نازل ہوئی۔ لیکن سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس قدر مزید روایت ہے کہ اگلے دن سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور نبی کریم ﷺ رو رہے تھے، تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے وجہ دریافت کی تو اس آیت کا نزول وجہ بتائی گئی یعنی یہ کہ فدیہ لینا خلاف منشائے حکم الٰہی تھا۔ روایت کے اس حصہ کے غلط ہونے پر چونکہ قرآن کریم صراحت سے گواہ ہے اس لیے یہ کسی طرح قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل کی وجوہات بتاتی ہیں کہ اسیران بدر کو فدیہ پر چھوڑنا عین حکم قرآن کے مطابق تھا۔

لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اگر اللہ کی طرف سے پہلے سے حکم نہ ہو چکا ہوتا تو تم کو اس بارے

اوّل: اگلے رکوع کی پہلی آیت یوں ہے ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ﴾ ''اے نبی! ان قیدیوں کو جو تمہارے ہاتھوں میں ہیں کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی جانتا ہے تو تم کو اس سے بہتر دے دے گا جو تم سے لیا گیا۔'' یعنی جو فدیہ تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر اللہ تعالیٰ تم کو دے دے گا۔ اگر قتل کرنا ضروری تھا تو ان کو یہ تسلی کسی طرح نہ دی جا سکتی تھی۔ یہاں تو فدیہ کی رقم سے بھی بہتر کا وعدہ دیا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ اس آیت کے نزول کے وقت تک قیدی چھوڑے تو گئے نہیں تھے۔ پس اگر رسول اللہ ﷺ کو منشائے الٰہی یہ معلوم ہوتا کہ انہیں قتل کرنا ضروری ہے تو اس وقت قتل کرنے میں کون مانع تھا۔

دوم: یہ قیدی تو عین اس حکم کے مطابق لیے گئے تھے کہ دشمن پر غالب آ کر قیدی پکڑ سکتے ہو بغیر غالب آنے کے نہیں اور جنگ بدر میں دشمن پر غلبہ مل چکا تھا اور باقاعدہ فوج سے جنگ ہو چکی تھی۔

سوم: دوسری جگہ صراحت سے یہ حکم قرآن شریف میں موجود ہے کہ جب دشمن پر غالب آ کر قیدی پکڑو تو یا تو ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دو یا بطور احسان۔ قیدیوں کو قتل کرنے کا حکم قرآن شریف میں کہیں نہیں۔ چنانچہ سورہ [محمد: 4:47] میں فرمایا ﴿فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۭ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۤ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً﴾ جب کافروں سے تمہاری جنگ ہو تو ان کی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب ان پر غالب آ جاؤ تو ان کو قید کر لو۔ پھر اس کے بعد یا احسان کے طور پر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔

چہارم: نبی کریم ﷺ نے بعض جنگوں میں ہزاروں کی تعداد میں قیدی پکڑے لیکن کبھی ان کو قتل نہیں کیا (یہود کا معاملہ الگ ہے اس لیے کہ ان کے اپنے منتخب کردہ ثالث کا فیصلہ تھا اور ان کی شریعت کے مطابق تھا۔) بلکہ جنگ بدر میں تو فدیہ لیا باقی جنگوں میں عموماً بطور احسان ہی آزاد کیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہی عملدرآمد مطابق قرآن کریم تھا۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ قرآن کریم میں تو یہ حکم ہو کہ قیدیوں کو قتل کر دو اور نبی کریم ﷺ کا عمل اس کے خلاف ہو۔ مگر یہ محض ایک خیال ہے کہ قرآن میں کوئی ایسا حکم ہے۔ نہ یہاں کوئی ایسا حکم ہے نہ کہیں دوسری جگہ قرآن شریف میں کوئی ایسا حکم ہے۔ بلکہ اس کے خلاف آزاد کرنے کا حکم ہے۔

پنجم: فدیہ کے فیصلہ کی تعمیل ہونے میں بہت دن لگے۔ یعنی جب تک مکہ سے زر فدیہ آئے اس وقت تک قیدی قبضہ میں تھے۔ جب نبی کریم ﷺ کو اپنی غلطی کی اطلاع مل گئی تھی تو اس کی اصلاح کیوں نہ کی؟ پھر بعض قیدیوں سے فدیہ بجائے روپے کے یہ لیا گیا کہ وہ کتابت سکھا دیں۔ یہ ایک دن کا کام نہ تھا بلکہ کئی مہینے اس پر لگے ہوں گے۔

ششم: [آیت: 69] میں فدیہ کو ﴿مِمَّا غَنِمْتُمْ﴾ میں داخل کر کے پھر اس کو صریح طور پر حلال ٹھہرایا ہے۔ غرض یہ بات بالکل خلاف صریح نص قرآن شریف ہے کہ ایسا ہوا ہو۔ اس آیت میں جو ذکر ہے وہ تو صاف ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ

اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٦٨﴾

میں جو تم کرنے لگے تھے بھاری عذاب پہنچ کر رہتا۔ (1255)

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٩﴾ ع 9 5 5

اس سے جو تم نے فتح پا کر حاصل کیا ہے حلال طیب کھاؤ اور اللہ کا تقویٰ کرو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (1256)

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٧٠﴾

اے نبی! ان کو جو تیرے ہاتھ میں قیدیوں میں سے ہیں کہہ دے اگر اللہ تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی جانے گا تو تم کو اس سے بہتر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (1257)

چاہتا تھا کہ قافلہ پر حملہ کیا جائے ﴿تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ﴾ [7] ''تم چاہتے تھے کہ جس کے پاس ہتھیار نہیں وہ تمہارے لیے ہو'' جو شروع سورت میں گزر چکا ہے۔ اس خیال کی نفی یہاں آخر پر اللہ تعالیٰ نے پھر کی ہے کہ قافلہ پر حملہ کرنا نبی کی شان کے شایاں نہ تھا۔ بلکہ ضروری تھا کہ میدان میں جنگ ہو کر پھر قید کیا جاتا۔ یہی اشارہ ﴿تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا﴾ میں ہے اور یہ صرف اس گروہ کا ذکر ہے جو قافلہ پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے اور نبی کریم ﷺ کو اس کے خلاف حکم تھا اور یہاں ﴿وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ﴾ اسی کے مطابق ہے۔ جو پیچھے فرمایا تھا ﴿وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ﴾ [الأنفال: 7:8] ''اور اللہ ارادہ کرتا تھا کہ اپنی پیشگوئیوں کے ذریعے سے حق کو ثابت کرے۔''

1255 - ﴿فِيْمَآ اَخَذْتُمْ﴾۔ [اَخَذَ فِيْ كَذَا] کے معنی لسان العرب میں دیئے ہیں بَدَأَ یعنی اس کام کو کرنا شروع کیا تھا یا اس کام کو کرنے لگا تھا اس لیے ﴿فِيْمَآ اَخَذْتُمْ﴾ سے مراد فدیہ کا لینا درست نہیں بلکہ اس سے مراد ہے وہ کام جو تم کرنے لگے تھے یعنی قافلہ پر حملہ کرنا۔ یعنی ایسا کرنا چونکہ مومنانہ شان کے خلاف تھا۔ گو عام جنگوں میں جائز ہوتا اس لیے اس کا نتیجہ عذاب ہوتا۔ ﴿كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ﴾ میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ یہ پہلے سے فیصلہ ہو چکا تھا کہ یہ جنگ ہو۔ جیسا کہ فرمایا ﴿لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا﴾ [44]

1256 - ان الفاظ میں غَنِمْتُمْ کا ذکر کر کے اسی فدیہ کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی فدیہ کا لینا تمہارے لیے جائز ہے کیونکہ دوسرے مال غنیمت کا ذکر پہلے آ چکا ہے اور قیدیوں کا فدیہ یقیناً مال غنیمت میں داخل ہے۔

1257 - **قیدیوں کے فدیہ کی مقدار:** عام فدیہ بیس اوقیہ فی قیدی تھا (اور اوقیہ چالیس درہم ہے۔) اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کا چالیس اوقیہ۔ بعض ان میں سے جنگ میں خلاف منشا بھی شامل ہوئے تھے۔ جیسے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ اور ابوالبختری ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے حکم بھی دے دیا تھا کہ ان کو قید نہ کیا جائے۔

وَ اِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾

اور اگر وہ تجھ سے دغا کرنا چاہیں تو پہلے اللہ سے دغا کر چکے ہیں سو اس نے ان پر (تم کو) قابو دے دیا' اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (1258)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۷۲﴾

جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ جنہوں نے (ان کو) پناہ دی اور مدد دی یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت نہیں کی تم پر ان کی دوستی کا کوئی حق نہیں، یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں۔ اور اگر تم سے دین کے متعلق مدد چاہیں تو تم پر مدد دینا فرض ہے سوائے اس کے کہ (یہ مدد) ان لوگوں کے خلاف ہو جن کے اور تمہارے درمیان عہد ہے۔ اور اللہ جو تم کرتے ہو اسے دیکھتا ہے۔ (1259)

1258 - نبی کریم ﷺ کی خیانت سے مراد یہ ہے کہ جو عہد کیا ہے کہ پھر مسلمانوں کے خلاف جنگ نہ کریں گے اس پر قائم نہ رہیں۔ اگر ان کا یہ ارادہ ہو تو بھی تم فکر مت کرو اس لیے کہ وہ اس سے بڑھ کر خدا کی خیانت پہلے کر چکے ہیں۔ یعنی بلا وجہ مسلمانوں پر چڑھ کر آئے تا کہ ان کو تباہ کریں اور خدا کا نام مٹا دیں۔

1259 - اس آیت میں مسلمانان مدینہ کے ان مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کا ذکر ہے جو کفار کے اندر رہ گئے تھے اور انہوں نے ہجرت نہیں کی۔ ان کے متعلق فرمایا کہ ان کی ولایت کا کوئی حق مسلمانوں پر نہیں یعنی ان مہاجرین اور انصار پر جو مدینہ میں ایک جمعیت بن گئی تھی اور جن کی اپنی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ گو محض مسلمان ہونے کے لحاظ سے وہ ان کے بھائی ہوں مگر ولایت جس میں لین دین، تجارت، میراث، عہد نصرت وغیرہ کے تعلقات شامل ہیں وہ ان کے ساتھ نہیں۔ کیونکہ ان کافر قوموں کے ساتھ ایسے تعلقات قائم نہیں۔ اور عام حالت ان کافر قوموں کی یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے دشمن تھے اور عموماً ان سے برسر پیکار تھے۔ پس جن کافر قوموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات ولایت نہیں جو مسلمان ان میں ملے رہ گئے ہیں اور وہاں سے ہجرت نہیں کرتے ان کو بھی انہی قوموں کے حکم میں رکھا ہے اور یہی حق بھی تھا اور دینی تعلق کی وجہ سے ایک حالت کو مستثنیٰ کیا ہے یعنی اگر

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾

اور جو کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو ملک میں فتنہ اور بڑا فساد ہوگا۔ (1260)

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾

اور جو ایمان لائے اور (انہوں نے) ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ جنہوں نے پناہ دی اور مدد دی، یہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے حفاظت اور عزت کا رزق ہے۔

مسلمان دین کے بارہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کو مدد دو اور ظاہر ہے کہ یہ مدد جنگ کی صورت میں ہوگی تا کہ ان کافر قوموں کے ظلم سے انہیں نجات حاصل ہو۔ اس طرح پر ان کی مدد کرنا مسلمانوں کا فرض قرار دیا۔ لیکن اس سے پھر ایک حالت کو مستثنیٰ کیا یعنی اگر ایک کافر قوم کے ساتھ تمہارا عہد ہو تو پھر دینی رنگ میں ان کی مدد کرنا جائز نہیں کیونکہ ایسی مدد اس معاہدہ کے خلاف ہوگی جو اس قوم کے ساتھ ہے اور معاہدہ بہر حال مقدم ہے۔ اور ایسا ہی نبی کریم ﷺ کا عمل بھی پایا جاتا ہے کہ آپ نے معاہدہ کو مقدم کیا۔ رہا یہ سوال کہ اگر ان مسلمانوں کی جو معاہد قوم میں ہوں دینی رنگ میں مدد کرنا جائز نہیں تو کیا ان سے تعلقات ولایت بھی ہوں گے یا نہیں۔ سو یہ امر ظاہر ہے کہ جب ایک کافر قوم سے مسلمانوں کا معاہدہ ہے تو ایک حد تک تعلقات ولایت تو ان سے قائم ہیں یعنی ان کے ساتھ لین دین تجارت وغیرہ ہوتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایسے معاہدات کی رو سے جنگوں میں وہ مسلمانوں کے اور مسلمان ان کے معاون ہو جاتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ جو مسلمان ان میں ہوں ان سے وہ تعلقات نہ ہوں صرف تعلقات وراثت کو ان کی صورت میں بھی جائز قرار نہیں دیا گیا۔ (ج۔ر)

1260 - ﴿اِلَّا تَفْعَلُوْهُ﴾ میں کس حالت کا ذکر ہے جس کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ زمین میں فتنہ وفساد کبیر ہوگا۔ فِتْنَةٌ قرآن کریم کی اصطلاح میں مسلمانوں کو بوجہ اسلام لانے کے جو دکھ دیا جاتا تھا اس پر بولا گیا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ﴿اِلَّا تَفْعَلُوْهُ﴾ میں کسی فعل کے نہ کرنے کا ذکر ہے اور اوپر جس فعل کے کرنے کا حکم تھا وہ صرف یہی تھا ﴿اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ﴾ یعنی **مسلمانوں کو جہاں کفار بوجہ مسلمان ہونے کے اذیت پہنچاتے ہوں وہاں مسلمانوں کی مدد کرنا مسلمانوں کا فرض قرار دیا گیا ہے۔** یہ نہیں کہ دوسرے مسلمان خاموش بیٹھتے دیکھتے رہیں۔ اس لیے اب یہ بتایا اگر ایسا نہ کرو گے یعنی وہ اپنے معاملہ میں تمہاری مدد چاہتے ہیں اور تم مدد نہیں کرتے تو پھر زمین میں فتنہ وفساد ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں فرمایا ﴿وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ یعنی کفار ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں تو تمہیں بھی ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔ ہاں تمہاری ایک

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾ ع 10 6 6

اور جو بعد میں ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کیا تو وہ تم میں سے ہی ہیں اور رشتہ کے تعلقات والے اللہ کے حکم میں آپس میں زیادہ حق دار ہیں۔ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ (1261)

دوسرے کی مدد دین کے بارہ میں چاہیے۔ کفار محض اغراض دنیا کو مدنظر رکھ کر بھی ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ یہ گویا اصلاح ہے جو اسلام نے کی اور دوسری اصلاح یہ کی کہ دینی ضروریات کے لیے بھی جنگ کرنی پڑے تو ان لوگوں کے خلاف جنگ نہ کرو جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے۔ گویا عہد کی عزت سکھائی کہ دینی ضروریات کے پیش آنے پر بھی اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

1261 - جب اخوت ایمانی کے تعلقات کا ذکر کیا تو ساتھ ہی تعلقات رشتہ داری کا بھی ذکر کیا۔ یعنی وہ تعلقات بھی اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ ہی ہیں۔ اس لیے وہ تعلقات جو اخوت ایمانی سے پیدا ہوئے ہیں ان کی غرض یہ نہیں ہو سکتی کہ تعلقات رشتہ داری جن کے لحاظ سے وراثت کے احکام اجرا پاتے ہیں باطل ہو جائیں۔ جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو عموماً بے کسی کی حالت میں تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری کے درمیان اخوت قائم کر دی تھی۔ جس کی ان سچے مومنوں نے یہاں تک عزت کی کہ گھر بار، مال اسباب تک نصف نصف دینے کو تیار ہو گئے اور وفات کی صورت میں حصہ میراث بھی۔ سو اس سے روکا۔ اس سے معلوم ہوا کہ **ابتدائی مسلمانوں میں تعلقات اخوت** کس قدر مضبوط تھے کہ ان میں افراط کا خطرہ ہو گیا تھا جس کو آیت قرآنی نے روک دیا۔ آج اس کی بجائے منافرت اور تباغض و تحاسد میں کمال حاصل کیا جا رہا ہے۔

سورۃ التوبۃ

نام:

اس سورۃ کا نام اَلتَّوْبَةُ یا اَلْبَرَآءَةُ ہے اور بھی کئی ایک نام اس کے احادیث میں آئے ہیں جیسے اَلْمُقَشْقِشَةُ یعنی شفا دینے والی۔ گویا نفاق سے شفا دیتی ہے اور اَلْمُنْفِرَة۔ البُحُوث۔ اَلْمُبَعْثِرَةُ وغیرہ جن ناموں میں اس کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کے ناموں میں ان کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اس سورت میں 16 رکوع اور 129 آیات ہیں اور اس کا نام بَرَآءَةٌ اس کی پہلی ہی آیت میں مذکور ہے ﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ﴾ جہاں ان کفار سے علیحدگی اور بیزاری کا اعلان ہے جو اپنے معاہدات پر قائم نہ رہتے تھے اور ایسا ہی اس سورت میں منافقین کو بھی بالکل الگ کر دیا ہے جو اب تک ملے جلے آتے تھے۔ پس اس کے نام میں یہ اشارہ ہے کہ شرک اور نفاق سے مسلمانوں الگ ہوتے ہیں اور کامل بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اس کا دوسرا نام اَلتَّوْبَةُ ﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ﴾ [117] سے لیا گیا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے ان فضلوں اور رحمتوں کا ذکر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر کیے اس لیے کہ انہوں نے سخت تنگی کے وقت میں نبی کریم ﷺ کی آواز پر لبیک کہا۔ یہاں تک کہ تیس ہزار آدمی اپنے سب کاروبار کو چھوڑ کر سخت گرمی کے موسم میں پکی ہوئی فصلوں کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ ہو گئے اور ایک لمبا اور صعوبت والا سفر اختیار کیا۔ اور مسلمانوں میں سے صرف تین آدمی پیچھے رہے۔

خلاصہ مضمون:

جیسا کہ اس سورت کے نام اَلْبَرَآءَةُ سے ظاہر ہے:

① پہلے رکوع میں ان کفار سے علیحدگی کا اعلان ہے جنہوں نے بار بار عہد شکنی کر کے مسلمانوں کو سخت تکلیف پہنچا رکھی تھی۔ چونکہ اسلام نے ملک عرب میں جنگوں کا خاتمہ کر کے اپنے اصول کو پھیلانا تھا اس لیے اب وقت آ گیا تھا کہ کفار کی شرارتوں کا سد باب ہمیشہ کے لیے کیا جاتا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ صرف کفر و شرک اس علیحدگی کی وجہ نہیں۔ چنانچہ حکم دیا کہ جن کفار نے عہد شکنی نہیں کی ان کے ساتھ تم بھی اپنے عہد کو پورا کرو۔ اور یہ بھی بتایا کہ باوجود مشرکوں کے معاہدات کے اختتام کے اگر ان قوموں میں سے کوئی شخص آ کر تمہاری پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دو اور اسے اصول اسلام سمجھاؤ۔ اگر وہ مسلمان نہ ہو تو پھر اسے صحیح سلامت اپنی قوم میں پہنچا دو۔

② دوسرے رکوع میں وجوہات قطع تعلقی دی ہیں اور کچھ ذکر ان لوگوں کا کیا ہے جن کے ساتھ ابھی جنگ ہونے والی تھی۔ اس لیے کہ انہوں نے اسلام لانے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیا اور اسلام کو نیست و نابود کرنے کا ارادہ کیا۔

③ تیسرے رکوع میں بتایا کہ اسلام مسلمانوں سے پوری مالی وجانی قربانی چاہتا ہے۔صرف یہ فخر کافی نہیں کہ ہم نے اس قدر مہمان نوازی کردی یا مسجدوں کی مرمت کردی یا مسجدیں بنالیں۔ بلکہ اپنے عزیزوں، اپنے اموال، اپنی جائدادوں، اپنی تجارتوں کو جب تک اسلام کے سامنے قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہوں اس وقت تک مسلمان نہیں۔

④ چوتھے میں بتایا کہ اپنی کثرت پر فخر نہ کرنا بلکہ وہ چیز جو تمہیں کامیاب کررہی ہے وہ نصرت الٰہی ہے اور فرمایا کہ مشرکوں کو آئندہ خانہ کعبہ کے پاس نہ آنے دو اور اس بات کا خوف مت کرو کہ اس سے تمہاری تجارتوں کو نقصان پہنچے گا۔ اور اہل کتاب بھی اگر تمہارے ساتھ جنگ کریں تو ان کا بھی مقابلہ کرو۔ اللہ تعالیٰ انہیں بھی مغلوب کرے گا۔

⑤ پانچویں میں اہل کتاب کی اسلام کے خلاف کوششوں کا ذکر کرکے اسلام کے آخری غلبہ کی پیشگوئی کی۔

⑥ چھٹے رکوع میں غزوہ تبوک کا ذکر کیا جس کی ضرورت عیسائیوں کی ہلچل سے پیش آئی اور منافقوں کے پیچھے رہ جانے کا ذکر کیا۔

⑦ ساتویں میں بتایا کہ منافق مصائب کے خوف کی وجہ سے پیچھے رہ گئے ہیں اور اس لیے بھی کہ وہ اسلام کو تباہ ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔

⑧ آٹھویں میں منافقوں کی ایذا رسانی کا ذکر کیا۔

⑨ نویں میں نفاق کا انجام ناکامی بتایا۔

⑩ دسویں میں منافقوں سے جہاد کا۔

⑪ اور گیارھویں میں ان سے کامل قطع تعلق کا حکم دیا۔

⑫ بارھویں میں اعراب کا ذکر کیا جن میں بہت سے منافق تھے۔

⑬ تیرھویں میں منافقوں کے مختلف گروہوں کا ذکر کرکے بتایا کہ ایک گروہ کو تو دو دفعہ عذاب ملے گا یہ دوسرا عذاب ان کی فضیحت تھی اور ایک گروہ کو اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق دے گا اور اسی میں مسجد ضرار کا ذکر کیا۔

⑭ چودھویں میں بتایا کہ مومنوں کا خدا کے ساتھ کیا عہد ہے؟ اور وہ انہیں کس طرح پورا کرنا چاہیے اور کس طرح پورا کررہے ہیں۔

⑮ پندرھویں میں بتایا کہ مومنوں کے حقیقی مجاہدات جن سے وہ مقام قرب حاصل کرسکتے ہیں یہی خدمات دینی ہیں۔

⑯ سولہویں میں بتایا کہ رسول اللہ ﷺ تو اصل میں دنیا کو گناہ اور ہلاکت سے نکالنے کے لیے آئے ہیں اور اسی پر سورت کا خاتمہ کیا۔

تعلق:

اس سورۃ کا الانفال سے یعنی پچھلی سورت سے ایسا شدید تعلق ہے کہ ان کو ایک ہی سورت کے دو حصے قرار دے کر درمیان میں بسم

اللہ الرحمن الرحیم بھی نہیں لکھی گئی اور اسی تعلق شدید کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بسم اللہ کا نزول اس سورت کی ابتدا میں آنحضرت ﷺ پر نہیں ہوا۔ سورۂ انفال میں بالخصوص جنگ بدر کا ذکر تھا اور مخالفین کو سمجھایا تھا کہ یہ جنگ تمہارے لیے ایک نشان ہے۔ اگر تم جنگ سے رک جاؤ تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر جنگ کو جاری رکھو تو تمہارا انجام ذلت اور مغلوبیت ہے۔ سورہ براءت میں اس ذلت اور مغلوبیت کا نقشہ کھینچا ہے کہ کس طرح آخر کار کفر کا زور ٹوٹا اور اسے اسلام کے سامنے نیچا دیکھنا پڑا۔ پھر سورۂ انفال میں ذکر تھا کہ مخالف بار بار عہد شکنی کرتے ہیں، اس عہد شکنی کا آخری علاج اب سورۂ براءت میں بتایا۔ غرض غور کیا جائے تو دونوں سورتوں کا مضمون بالکل مسلسل معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ الانفال اور اس کے نزول میں سات سال کے قریب فرق ہے۔ جس میں طرح طرح کے واقعات پیش آئے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم الٰہی میں کس طرح پر ان واقعات اور امور میں ایک ربط تھا۔

زمانۂ نزول:

﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ﴾ اور سورت کی ابتدائی آیات کا اعلان ہجرت کے نویں سال میں ذیقعد میں ہوا۔ پس یہ اسی سال کی نازل شدہ ہیں۔ بقیہ حصہ سورت میں سے کثیر حصہ کا تعلق جنگ تبوک سے ہے اور یہ جنگ نویں سال ہجرت میں پیش آئی۔ پس یہ سورت کل کی کل نویں سال ہجرت کی ہے۔ ہاں اگر ایک دو آیات جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے بعد میں نازل ہوئی ہوں تو ہوسکتا ہے مگر اصل سورت کا نزول یقیناً نویں سال ہجرت کا ہی ہے۔

اٰیَاتُھَا 129 سُوْرَۃُ التَّوْبَۃِ مَدَنِیَّۃٌ (9) (113) رُکُوْعَاتُھَا 16

بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖٓ اِلَی الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿١﴾

یہ علیحدگی (کا اعلان) ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مشرکوں میں سے ان لوگوں کی طرف جن کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا تھا۔(1262)

1262- بَرَآءَۃٌ۔ بُرْءٌ اور بَرَآءٌ اور تَبَرِّیْ کے معنی ہیں اس سے علیحدگی جس سے انسان کو کراہت ہو۔ اسی لیے بیماری سے اچھا ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اور جسے ناپسند کیا جائے اس سے علیحدگی پر بھی اور ایسے شخص کو بَرِیٌّ اور قوم کو بَرَآءٌ کہا جاتا ہے ﴿اَنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُہٗ﴾[3] ''اللہ اور اس کا رسول ان مشرکوں سے بے زار ہے۔'' ﴿اَنْتُمْ بَرِیْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٤١﴾﴾[یونس: 41:10] ''تم اس سے بری ہو جو میں کرتا ہوں اور میں اس سے بری ہوں جو تم کرتے ہو۔'' ﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا﴾[البقرۃ: 166:2] ''جب وہ جو پیشوا بنائے گئے بیزار ہو جائیں گے۔'' ﴿اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْکُمْ﴾[الممتحنۃ: 4:60] ''ہم تم سے بے تعلق ہیں۔'' (غ)

سورۂ انفال جنگوں کی ابتدا کی خبر دیتی ہے تو یہ سورۃ ان کے خاتمہ کی۔ یا وہ کفار کی پہلی کارروائیوں کا ذکر کرتی ہے تو یہ اُن کے انجام کا۔ پس سب سے پہلے رکوع میں ان مشرکین سے قطع تعلق کا ذکر ہے جنہوں نے بار بار عہد شکنی کا ارتکاب کیا تھا۔ مسلمانوں کو ایک بڑی تکلیف جو عرب کی مشرک قوموں سے پہنچتی رہتی تھی یہ تھی کہ ایک دن یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ عہد کر لیتے اور مسلمان ان کی طرف سے مطمئن ہو جاتے لیکن اگلے ہی دن ذرا مخالفین کا دباؤ پڑا تو عہد شکنی کر دیتے۔ اب جبکہ فتح مکہ کے بعد ملک عرب میں جنگوں کا خاتمہ ہو رہا تھا یہ ضروری ہوا کہ ان عہد شکنیوں کی گنجائش کا خاتمہ کیا جائے اور ملک میں ایک عالمگیر صلح کی بنیاد رکھی جائے۔ چنانچہ نویں سال ہجری میں حج کے موقعہ پر اس سورت کی پہلی چند آیات کا تمام اطراف ملک سے جمع شدہ قبائل میں اعلان کیا گیا۔ اس سال حج کے لیے نبی کریم ﷺ خود تشریف نہیں لے گئے بلکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حاجیوں پر امیر مقرر کر کے بھیجا اور آپ کی روانگی کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا کہ سورۂ توبہ کی پہلی آیات کا اعلان کر دیں۔ جس کے بعد ذیل کے امور کا اعلان کیا گیا۔

1. اول یہ کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک خانہ کعبہ کے قریب نہ جائے گا۔
2. دوم یہ کہ کوئی شخص ننگا ہو کر طواف نہ کرے گا۔
3. سوم یہ کہ ہر ایک عہد پورا کیا جائے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ ان آیات میں ان تمام مشرکین عالم کا ذکر نہیں بلکہ تمام مشرکین عرب کا بھی ذکر نہیں، جیسا کہ چوتھی آیت سے ظاہر ہے۔ یہ اعلان صرف ان لوگوں کے متعلق تھا جو بار بار عہد کر کے خلاف ورزی کرتے تھے۔ کیونکہ جنہوں نے عہد کر کے خلاف

فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝۲

پس چار مہینے ملک میں چلو پھرو اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں اور کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔ (1263)

وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ۝۳

اور (یہ) اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو حج اکبر کے دن اطلاع ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان مشرکوں سے بے زار ہے۔ پس اگر تم توبہ کرو تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر پھر جاؤ تو جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں اور جنہوں نے انکار کیا اُن کو دردناک عذاب کی خبر دے۔ (1264)

ورزی نہیں کی ان کے ساتھ عہد پورا کرنے کا وہاں صریح حکم موجود ہے اور حضرت علیؓ نے جن باتوں کا اعلان کیا ان میں سے ایک عہدوں کا ایفا تھا۔ پس ان آیات سے مشرکین دنیا سے عام جنگ کا حکم نکالنا ایسی تاویل ہے جو صریح نص قرآنی کے خلاف ہے۔

1263 - لکھا ہے کہ اس سال حج بسبب نسئ کے (یعنی اس تاخیر کے جو حج کے مہینوں میں کر لی جاتی تھی) ذیقعد میں ہوا۔ ہر حال میں چار مہینے اس وقت سے دیئے گئے۔ جب یہ اعلان حج کے دن ہوا۔ یہ خیال کہ فتح مکہ کی وجہ سے چونکہ مسلمانوں کا غلبہ ہو گیا تھا اس لیے **ان معاہدات کے ختم ہو جانے کا اعلان کیا گیا**، صحیح نہیں۔ فتح مکہ کا واقعہ رمضان 8 ہجری کا ہے اور یہ چودہ ماہ بعد کا واقعہ ہے باوجود فتح مکہ کے جس کا تعلق صرف قریش سے تھا دوسری اقوام عرب کی طرف سے مسلمانوں کو تکلیفیں پہنچتی رہی تھیں۔ بلکہ یہاں جو لفظ استعمال فرمائے ہیں کہ جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک یہ لوگ اسلام کے خلاف منصوبوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس لیے جیسا کہ اس سے پیشتر سورۂ انفال میں مدت پہلے حکم ہو چکا تھا ﴿وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ﴾ [الأنفال: 58:8] ''اور اگر تجھے کسی قوم سے دغابازی کا خوف ہو تو (ان کا عہد) برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے۔'' جب بار بار کی عہد شکنی کی وجہ سے ملک میں فتنہ و فساد کا خاتمہ نہ ہوتا تھا تو آنحضرت ﷺ نے اس حکم الٰہی کے ماتحت نہایت صفائی سے چار ماہ کی مہلت دے کر ان عہدوں کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ اور یہ بات کہ اصل وجہ اس اعلان کی وہ فتنہ فساد ہی تھا جو عہد شکنی سے پیدا ہوتا تھا نہ ان لوگوں کا کفر۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ چوتھی آیت میں ان کافر قوموں کو مستثنیٰ کر دیا ہے جنہوں نے عہد کر کے عہد شکنی نہیں کی۔

1264 - ﴿يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ﴾ اس میں اختلاف ہے کہ آیا اس سے مراد قربانیوں کا دن یعنی دسویں ذی الحج ہے یا عرفہ کا دن یعنی

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴

مگر جن مشرکوں کے ساتھ تم نے عہد کیا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کو مدد دی تو اُن کے ساتھ اُن کا عہد ان کی مدت تک پورا کر دیں۔ اللہ متقیوں سے محبت رکھتا ہے۔ (1265)

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵

پھر جب حرمت والے مہینے نکل جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور ان کو پکڑ لو اور ان کو روک دو اور ان کے لیے ہر گھات کی جگہ بیٹھو پھر اگر توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا رستہ چھوڑ دو۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (1266)

میدان عرفات میں اجتماع کا۔ چونکہ تاریخ سے یہی ثابت ہے کہ اعلان یوم النحر یعنی دسویں ذی الحج کو ہوا اس لیے قول اول کو ترجیح ہے اور نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث بھی اسی کی موید ہے کہ آپ نے یوم النحر کو ﴿يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ﴾ فرمایا۔

1265 - یہ استثناء صاف بتاتا ہے کہ مشرکین سے قطع تعلق کی وجہ صرف ان کی عہد شکنی ہوئی تھی، جہاں عہد شکنی نہیں ہوئی ان کے ساتھ عہد پورا کرنے کو اتقاء قرار دیا ہے۔ گویا اس اعلان کی اصل وجہ شرک یا کفر نہیں بلکہ عہد شکنی ہے۔ مفسرین نے یہاں صرف بنی حمزہ اور بنی مدلج کا ذکر کیا ہے کہ کنانہ کے یہ دو قبیلے ایسے تھے جن کی مدت عہد باقی تھی۔ لیکن خود خزاعہ جن کی خاطر مکہ پر چڑھائی کی گئی مسلمانوں کے معاہد تھے۔ اور یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا عہد مدت معینہ تک تھا، شاید اور بھی اس قسم کے عہد ہوں۔

1266 - ﴿الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ﴾ سے مراد یہاں وہی چار ماہ ہیں جن کے متعلق اوپر اعلان ہو چکا کہ ان میں جنگ نہ کی جائے گی۔ ان کو حرمت والے مہینے یا تو اسی لیے کہا کہ جنگ ان کے اندر رکی رہے گی اور یا اس لیے کہ ذیقعد اور ذی الحج اور محرم جو ان چار ماہ میں شامل تھے اور بیشتر حصہ ان چار ماہ کا تھے۔ حرمت والے مہینے تھے۔

احْصُرُوْهُمْ۔ حَصَرَ کے معنی تَضْيِيْق اور اُحْصُرُوْهُمْ کے معنی ہیں [ضَيِّقُوْا عَلَيْهِمْ] (غ) یعنی ان کو تنگ کر کے روک دو [اَحْصَرَهُ الْعَدُوُّ، اِذَا ضَيَّقَ عَلَيْهِ فَحَصَرَ] یعنی جب دشمن کسی کو یہاں تک تنگ کر دے کہ وہ رک جائے تو [اَحْصَرَهُ

وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ

اور اگر ان مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اُس کو پناہ دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اس کو اس

الْعَدُوُّ] کہا جاتا ہے اور حَصَرَ اور اِحْصَار کے اصل معنی منع یعنی روک دینا ہیں۔(ل) اور گو حصر کے معنی حبس یعنی قید کرنا بھی ہیں۔مگر چونکہ یہاں خُذُوْهُمْ پہلے آ چکا ہے جس کے معنی ہیں گرفتار کرلو اس لیے حصر سے مراد کسی دوسری طرح پر روک دینا ہیں جیسے ﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾[البقرة: 273:2] ''ان محتاجوں کے لیے جو اللہ کی راہ میں روکے گئے ہیں۔'' میں کسی طرح رک جانا مراد ہے نہ قید سے اور ابن جریر نے وَاحْصُرُوْهُمْ کے معنی کیے ہیں[وَامْنَعُوْهُمُ التَّصَرُّفَ فِي بِلَادِ الْاِسْلَامِ وَدُخُوْلِ مَكَّةَ] یعنی ان کو بلاد اسلامی میں آنے جانے اور مکہ میں داخل ہونے سے روک دو۔

مَرْصَدٍ۔ رَصَدٌ کے معنی گھات میں بیٹھنا اور مَرْصَدٌ گھات کی جگہ ہے۔رَصَدٌ اور اِرْصَادٌ کے ایک ہی معنی ہیں ﴿وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ﴾[التوبة: 107:9] ''اور اس شخص کے لیے گھات جس نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کی۔''

وہ معترضین جو قرآن کریم کو اگر دیکھیں بھی تو بالکل سطحی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں اس آیت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام میں ہر کافر کو قتل کر دینے کا حکم ہے۔کیونکہ یہاں ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾ آ گیا ہے۔تعصب کی عینک کبھی انسان کی نظر کو صاف نہیں رہنے دیتی۔ یہاں شروع سے ایک خاص ذکر چلا آتا ہے یعنی **ان مشرکوں کا ذکر جنہوں نے بار بار عہد کی خلاف ورزیاں کیں** ﴿يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ﴾[الأنفال: 56:8] ''وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں۔'' پہلے بھی ان کے متعلق آ چکا ہے۔ یہاں نہ ان مشرکوں کا کوئی ذکر ہے جن سے کوئی عہد ہی نہیں ہوا نہ ان کا جنہوں نے عہد کر کے خلاف ورزی نہیں کی۔ بلکہ پہلی ہی آیت میں بیزاری کو صرف ان لوگوں تک محدود کر کے جن سے عہد ہوا ﴿الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ﴾ ان تمام مشرکوں اور کفار کو اس سورت کے مضمون سے بے تعلق کر دیا جنہوں نے مسلمانوں سے کوئی عہد نہ کیا تھا۔اور عہد کر کے پورا کرنے والوں کو الگ مستثنیٰ کر دیا۔تو باقی صرف وہ چند مشرک رہ گئے جنہوں نے عہد کر کے بار بار اس کی خلاف ورزی کی **اور سزا جو یہاں تجویز کی گئی ہے وہ محض ان کی بار بار کی عہد شکنی کی وجہ سے تھی۔** اس سزا میں بھی صرف قتل کرنا نہیں بلکہ قتل، گرفتار کر لینا، روک دینا ہے **اور اس سزا کی غرض** صاف معلوم ہوتی ہے کہ وہ شرارت کرنے سے رک جائیں ان کو قتل کرنا مقصود اصلی نہیں۔ بلکہ شرارت کو روکنا مقصود اصلی ہے۔اس لیے اگر کسی طریق سے رک جائیں تو وہ طریق کافی ہے ورنہ گرفتار کیے جا سکتے ہیں اور یہ دونوں صورتیں نہ ہو سکیں تو پھر ایسے شریروں کو قتل کرنا حفاظت و امن قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے اور یا یہ سزائیں بلحاظ جرم کے الگ الگ ہیں یعنی جو بہت شریر ہیں ان کو قتل کر دو جو کسی طرح سے باز نہیں آتے، جو اس سے کم ہیں انہیں گرفتار کر لو، جو بغیر قید کے رہ سکتے ہیں ان کو دوسرے طریقوں سے روک دو اور جو پکڑے نہیں جاتے ان کے لیے گھات میں بیٹھو۔اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اس صورت میں ہے کہ وہ بلاد اسلامی میں آئیں، جیسا ابن جریر نے وَاحْصُرُوْهُمْ کی تفسیر میں لکھا ہے۔اور یہ اگلے الفاظ ﴿فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾ سے ظاہر ہے جہاں فرمایا کہ ان کا رستہ کھلا چھوڑ دو اور [آیت: 6] سے بھی یہی ظاہر ہے

مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ ع
کے امن کی جگہ پہنچا دو یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو جانتے نہیں۔ (1267)

جہاں مشرکوں کی پناہ مانگنے کا ذکر ہے۔

اس سزا کی معافی کی صورتیں:

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہاں چونکہ ان لوگوں کے چھوڑ دینے کا حکم ہے جو توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اس لیے گویا باقی سب کو قتل کرنے کا حکم ہے، تو یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ مجرم تو وہی ہیں جنہوں نے عہد شکنی کی۔ ہاں ان مجرموں کے بعض حالات میں چھوڑ دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو لوگ اس حکم کے ماتحت تھے ہی نہیں وہ بھی اس استثناء کی وجہ سے زیر مؤاخذہ آ گئے ہیں۔ یعنی سزا دینے کا حکم صرف ان لوگوں کے لیے تھا جو عہد شکنی کریں۔ پھر ان مجرموں میں سے ان کو مستثنیٰ کر دیا جو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔ تو اس سے یہ لازم نہ آیا کہ جو مجرم تو کبھی تھے ہی نہیں نہ انہوں نے عہد کیا تھا نہ عہد شکنی کی تھی تو اب وہ محض اس لیے کہ نماز نہیں پڑھتے مجرم بن کر مستحق سزا ہو گئے۔ محض نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے، زکوٰۃ نہ دینے کی وجہ سے، اسلام نہ لانے کی وجہ سے قرآن کریم نے کسی شخص کو مستحق سزا قرار نہیں دیا (اس کی سزا عالم آخرت میں ہے) ہاں عہد شکنی کے لیے مستحق سزا قرار دیا۔ اور اس سزا کی جس کے وہ مستحق ہو چکے تھے اس صورت معافی کا اعلان کر دیا جب وہ مسلمان ہو جائیں اور یہ صرف ایک صورت ہے۔ کیونکہ اسلام میں داخل ہونے سے ان کی شرارتوں کا کامل طور پر سد باب ہو جاتا تھا۔ دوسری صورتیں یہ بھی ہیں کہ ان کو گرفتار کر لیا جائے یا ان کو روک دیا جائے۔ مگر چونکہ عرب میں ہر قوم بجائے خود آزاد تھی اس لیے روکنا بغیر اس کے نہ ہو سکتا تھا کہ وہ مغلوب ہو جائیں جس کے لیے قتال کی ضرورت پیش آتی اور اس میں بعض قتل بھی ہو جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف قتل کا کہیں حکم نہیں۔ غرض تلوار یا اسلام کا پیش کرنا اسلام پر مخالفین کا محض افترا ہے۔

1267 - اسْتَجَارَكَ۔ ''تیری مجاورت چاہے۔'' یعنی تجھ سے امن چاہے بعد انقضائے مدت معینہ کے۔ یہ لفظ خود بتاتا ہے کہ انہی مجرم عہد شکن مشرکوں کا ذکر ہے جو مجرم نہیں اس کو پناہ مانگنے کی ضرورت ہی نہیں۔

چونکہ پچھلی آیت میں کہا تھا کہ جو مسلمان ہو جائے اسے معاف کر دو۔ لیکن اسلام لانے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں سے ملیں اور دین اسلام کے متعلق دریافت کریں۔ اس لیے فرمایا کہ وہی مشرک جن کا ذکر ان آیات میں ہے کہ وہ مستحق سزا ہیں **اگر دین اسلام کے متعلق کچھ باتیں دریافت کرنے کے لیے تم سے امن مانگیں تو ان کو امن دو۔ پھر یہ نہیں کہ وہ سن کر مسلمان نہ ہو تو اسے مار ڈالو۔ بلکہ اس حالت میں اسے امن کے ساتھ اپنی قوم کے مقام سکونت میں واپس پہنچا دو۔** یہی تفسیر ابن جریر سے مروی ہے [ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ. يَقُوْلُ: ثُمَّ رُدَّهُ بَعْدَ سِمَاعِهِ كَلَامَ اللهِ إِنْ هُوَ أَبَىٰ أَنْ يُّسْلِمَ، وَلَمْ يَتَعَظَّ بِمَا تَلَوْتَهُ عَلَيْهِ مِنْ كَلَامِ اللهِ فَيُؤْمِنُ "إِلٰى مَأْمَنِهِ"، يَقُوْلُ: إِلٰى حَيْثُ يَأْمَنُ مِنْكَ وَمِمَّنْ فِيْ طَاعَتِكَ، حَتّٰى يَلْحَقَ بِدَارِهِ وَقَوْمِهِ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ] یعنی ﴿اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ﴾ سے مراد یہ ہے کہ پھر اسے لوٹا دو بعد اس کے کہ

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۷

ان مشرکوں کے لیے اللہ کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک عہد کیوں کر ہوسکتا ہے؟ سوائے ان کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس عہد کیا۔ سو جب تک وہ تمہارے لیے قائم ہیں تم اُن کے لیے قائم رہو۔ اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے۔ (1268)

كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَ اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸ۚ

(عہد) کس طرح ہو حالانکہ اگر وہ تم پر غالب آئیں تو تمہارا کچھ لحاظ نہ کریں نہ ناطے کا اور نہ ہی عہد کا۔ وہ اپنے مونہوں سے تم کو راضی کرتے ہیں اور اُن کے دل انکار کرتے ہیں اور اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں۔

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا

اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی قیمت لے لی

وہ اللہ کا کلام سن لے اگر وہ اسلام لانے سے انکار کرے اور جو کچھ اللہ کا کلام اس پر پڑھا گیا ہے اس سے نصیحت حاصل نہ کرے تو اسے اس کی امن کی جگہ پہنچا دیا جائے یعنی ایسے مقام پر جہاں تجھ سے اور ان لوگوں سے جو تیری اطاعت میں ہیں امن میں ہو جائے۔ یہاں تک کہ اپنے گھر پہنچ جائے اور اپنی مشرک قوم کے ساتھ مل جائے۔ کاش ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں قرآن کی کہانی بنانے والے کبھی ان الفاظ پر غور کرتے۔ یہ اس مشرک کا ذکر ہے جو مجرم ہو چکا ہے۔ اتفاق سے مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا وہ پناہ مانگتا ہے رسول اللہ ﷺ اسے خدا کا کلام سناتے ہیں وہ اسلام لانے سے انکار کرتا ہے۔ یہاں تو کھلا حکم قتل کا ہونا چاہیے تھا مگر حکم یہ ہے کہ اسے اپنے گھر حفاظت سے واپس پہنچا دو۔ اور وجہ کیا دی ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ اسلام کی تعلیم کی خوبی سے واقف نہیں اور نہیں جانتے کہ اللہ پر ایمان لانے سے انسان کیا فوائد حاصل کرتا ہے۔

1268 - اس رکوع میں انہی مشرکوں کا ذکر ہے جن کا ذکر پچھلے رکوع میں تھا یعنی عہد شکنی کرنے والے جیسا کہ خود مضمون بھی شاہد ہے اور ان سے قطع تعلق کی وجوہات بیان کی ہیں ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ﴾ وہی ہیں جن کا ذکر پیچھے [آیت:4] میں ہو چکا ہے۔ پھر فرمایا کہ عہد کو قائم کرنا بڑا اتقاء ہے۔ **یہ عہد کی عزت ہے جو اسلام نے سکھائی ہے۔** مسلمان کبھی عہد نہیں توڑ سکتا۔ خواہ مفاد قومی کو بھی نقصان پہنچتا ہو۔

فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹

یوں اس کی راہ سے روکا۔ برا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝۱۰

کسی مومن کا لحاظ نہیں کرتے، نہ ناطے کا اور نہ ہی عہد کا۔ اور وہ حد سے بڑھے ہوئے ہیں۔ (1269)

فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ وَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۱۱

سو اگر توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، تو دین میں تمہارے بھائی ہیں۔ اور ہم اُن لوگوں کے لیے باتیں کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

وَ اِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا

اور اگر وہ اپنے عہد کے بعد اپنی قسموں کو توڑیں اور تمہارے دین میں عیب لگائیں تو کفر کے سرداروں

1269 - يَرْقُبُوْنَ۔ رَقَبَ اس دیکھنے کو کہتے ہیں جو حفظ و رعایت کے طریق پر ہو۔

اِلّ۔ راغب کے نزدیک ہر حالت ظاہری پر بولا جاتا ہے خواہ قسم کے عہد سے ہو یا قرابت کے۔ مگر یہاں جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے قرابت ہی مراد ہے۔

ذِمَّةً۔ ذَمّ کے معنی مذمت کرنا یا دوسرے کو برا کہنا ہیں ﴿مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا﴾ [بنی إسرائیل: 18:17] ''برے حال میں دھتکارا ہوا'' اور ذِمَّةً عہد کے ضائع کرنے پر مذمت کا ہونا ہے۔ (غ)

کفار کا مسلمانوں سے سلوک:

یہ حالت عام اہل عرب کی تھی کہ جن کے ساتھ عہد ہو ذرا طاقت پکڑی تو عہد کو توڑ ڈالا جیسا کہ دوسری جگہ قرآن شریف میں مذکور ہے، ﴿تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ﴾ [النحل: 92:16] ''تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا موجب بنا لیتے ہو اس لیے کہ ایک جماعت دوسری جماعت سے بڑھ کر ہو'' یہی حال اُن کا مسلمانوں کے ساتھ تھا اور اس کی وجوہات تو اور بھی قوی تھے۔ دل سے مسلمانوں کے دشمن تھے۔ عہد صرف ظاہری طور پر کر لیتے تھے۔ حالانکہ دلوں میں بغض مخفی ہوتا، اس لیے موقع کی تاک میں رہتے تھے۔ جب کسی مسلمان کو نقصان پہنچانے کا موقعہ ملتا نہ قرابت کا لحاظ کرتے نہ عہد کی خلاف ورزی کا۔

اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ⑫

کے ساتھ جنگ کرو، ان کی قسمیں کچھ نہیں تاکہ وہ باز آئیں۔ (1270)

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَ هَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَ هُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ⑬

کیوں ان لوگوں کے ساتھ جنگ نہ کرو جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں اور رسول کے نکال دینے کا قصد کیا اور انہوں نے پہلے تمہارے ساتھ ابتدا کی، کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ بلکہ اللہ ہی زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ⑭ۙ

ان سے جنگ کرو اللہ اُن کو تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور ان کو رسوا کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمہیں مدد دے گا اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا بخشے گا۔

1270 - حذیفہ سے یہ روایت ہے کہ اس آیت کے مذکور کفار سے جنگ نہیں ہوئی۔ (ج) اور بعض نے اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ سے مراد ابوجہل وغیرہ کو لیا ہے جو کسی صورت میں درست نہیں۔ گو [آیت نمبر: 13] کے الفاظ سے خیال اس طرف جاتا ہو۔ اس لیے کہ یہ سورت یقیناً نویں سال کی ہے اور ابوجہل وغیرہ جنگ بدر میں ہلاک ہو چکے تھے۔ لیکن [آیت نمبر: 13-15] کے الفاظ اس بات کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتے جو حذیفہ سے مروی ہے۔ یعنی یہ کہ ان لوگوں سے کبھی جنگ نہیں ہوئی۔ کیونکہ [آیت: 14] میں صاف حکم ہے کہ ان لوگوں سے جنگ کرو اور پیشگوئی موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے ان کو عذاب دے گا۔ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ **یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو مسلمان ہونے کے بعد اپنے عہد وغیرہ کو توڑ دیں** جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے آخری ایام میں **مسیلمہ کذاب** نے کیا اور آپ کی وفات کے بعد بعض دیگر اقوام عرب نے جن کے خلاف سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فوج کشی کی اُن کا **زکوٰۃ دینے سے انکار کرنا بھی نکث ایمان** تھا۔ اور طعن فی الدین کرنے والے مسیلمہ اور اسود اور دوسرے لوگ تھے۔ رہی یہ بات کہ ان کے متعلق [آیت نمبر: 13] میں فرمایا ﴿وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ﴾ سو مسیلمہ وغیرہ کا ایسا کرنا ظاہر ہے کہ وہ یہ قصد کر چکا تھا اور قریش کا آنحضرت ﷺ کو نکالنا ان الفاظ میں نہیں آ سکتا کیونکہ وہ تو یہ کام کر چکے تھے ان پر هَمُّوْا صادق نہیں آ سکتا اور یہ الفاظ کہ ﴿يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۙ وَ يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ﴾ بھی مسیلمہ اور اس کے ساتھیوں پر ہی صادق آتے ہیں کہ ان کی وجہ سے جو مسلمانوں کو سخت رنج پہنچا تھا ان کی ہلاکت سے وہ دور ہو گیا۔ محض طعن فی

وَ يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۱۵

اور ان کے دلوں سے غصہ دور کر دے گا اور اللہ جس پر چاہتا ہے رجوع برحمت کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (1271)

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ لَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لَا رَسُوْلِهٖ وَ لَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۶ ع

کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم چھوڑ دیئے جاؤ گے اور اللہ نے تم میں سے اُن کو ابھی الگ نہیں کیا جنہوں نے جہاد کیا اور نہ اللہ کے سوائے اور نہ اس کے رسول اور نہ مومنوں کے (سوائے) کسی کو دِلی دوست بنایا ہے اور اللہ اس سے واقف ہے جو تم کرتے ہو۔ (1272)

الدین پر قتل کا فتویٰ ان الفاظ سے نہیں نکل سکتا۔

1271 - ﴿يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ﴾ قُلُوْبِهِمْ میں ضمیر مخالفین کی طرف ہے یعنی ان کے دلوں میں جو غیظ وغضب اسلام کی تباہی کے لیے پیدا ہوگا اللہ اس کو بھی دور کر دے گا اور یہ دونوں طرح ہوسکتا ہے۔ کفار کے ذلیل ہوجانے سے بھی اور ان کے مسلمان ہونے سے بھی۔ جس کی طرف ﴿وَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ﴾ میں اشارہ کیا ہے۔

1272 - وَلِيْجَةً۔ وُلُوْجٌ تنگی میں داخل ہونے کا نام ہے ﴿حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ [الأعراف: 40:7] ''جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو۔'' ﴿تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ﴾ [آل عمران: 27:3] ''تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے۔'' اور وَلِيْجَةً وہ ہے جو انسان کے اہل میں سے تو نہ ہو مگر انسان اسے ایسا دوست بنائے جس پر اعتماد ہو۔ (غ)

یہ کون لوگ ہیں جن کو ممیز کرنے کا یہ ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے سابقین اولین مراد نہیں جو جہاد بھی کر چکے اور اپنا اخلاص اللہ اور رسول کے لیے بھی دکھا چکے ہیں۔ بلکہ ان کا ذکر ﴿وَ لَا الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ میں ہے اور حَسِبْتُمْ میں مخاطب وہ لوگ ہیں جو ادھر ادھر اقوام میں ملے جلے دین اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ تو فرمایا کہ ابھی ضرورت ہے کہ تمہارا خلوص اللہ کے لیے ترقی کرے۔ اس لیے نئی مشکلات تمہارے رستہ میں آئیں گی، یا نئے مسلمان مراد ہیں جواب دین اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ ان کو بتایا ہے کہ تم کو بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرنا پڑے گا اور اپنے خلوص کا ثبوت دینا ہوگا۔ یہ ان لوگوں کا بھی جواب ہے جو اسلام پر بہ جبر مسلمان کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ جو مجبور ہو کر مسلمان ہوئے تھے انہوں نے جہاد کیا کرنا تھا اور اخلاص کیا دکھانا تھا۔ صرف منہ سے کچھ کہہ دینے پر تو اسلام راضی نہیں ہوتا۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَ فِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾

مشرکوں کا کام نہیں کہ اپنے اوپر کفر کی گواہی دیتے ہوئے اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں۔ ان کے عمل بے کار ہیں اور وہ آگ کے اندر رہیں گے۔ (1273)

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾

اللہ کی مسجدیں صرف وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور نماز کو قائم کیا اور زکوٰۃ دی اور اللہ کے سوائے کسی کا خوف نہ کیا۔ سو امید ہے کہ یہ ہدایت پانے والوں میں سے ہوں۔

1273 - يَّعْمُرُوْا۔ عِمَارَةٌ ویران کرنے کی ضد ہے یعنی آباد کرنا۔ اور مسجد کے آباد کرنے میں اس میں رہنا یا اس میں آنا بھی داخل ہے۔ اور اس کا تعاہد مرمت وغیرہ بھی داخل ہے۔

﴿مَسٰجِدَ اللّٰهِ﴾ مشرک باقی مسجدوں سے تو کچھ تعلق نہ رکھتے تھے البتہ مسجد حرام پر اپنا حق جتاتے تھے کہ ہم اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں تو اسی کو یعنی مسجد حرام کو ہی ﴿مَسٰجِدَ اللّٰهِ﴾ کہا۔ اس لیے کہ وہ سب مسجدوں کا قبلہ ہے۔ یا ایک خاص دعویٰ کو عام لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔

پچھلے رکوع کے آخر پر ذکر کیا تھا کہ ایک مسلمان کو صرف اتنی بات پر نہیں چھوڑا جاتا کہ منہ سے اپنے آپ کو مسلمان کہہ دے بلکہ جہاد اور خلوص کا ظاہر ہونا اس سے ضروری ہے۔ اس لیے اب یہاں بتایا کہ اسلام کیسی قربانیاں چاہتا ہے اور چونکہ کفار صرف اسی قدر کو بڑی خدمت سمجھتے تھے کہ خانہ کعبہ کے ہم خدمت گزار ہیں، حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں، مرمت وغیرہ کرتے ہیں اور یوں اس گھر کو آباد رکھتے ہیں تو یہ سمجھانے کے لیے کہ یہ کوئی بڑے مجاہدانہ کام نہیں کہ مسلمان بھی مسجدوں کے متولی ہونے کو اپنا فخر سمجھیں۔ بلکہ خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانیاں بکار ہیں۔ شروع یہاں سے کیا کہ مشرک جو ان کاموں پر فخر کرتے ہیں اول تو حق ہی کیا رکھتے ہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں۔ کیونکہ مسجد اللہ کی عبادت کے لیے بنائی گئی ہے اور یہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ اپنے آپ پر کفر کی شہادت ہے کیونکہ اس وقت خانہ کعبہ بتوں سے بالکل پاک ہو چکا تھا تو اس لیے اب بت پرستوں کا خانہ کعبہ میں جانا یا اس کی کوئی خدمت کرنا خود ان کے اپنے معتقدات کے خلاف تھا اور اس طرح پر شروع کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ آئندہ مشرک خانہ کعبہ کا حج نہ کریں، اس کی وجہ بھی بتا دی۔ اور یہ جو فرمایا کہ ان کے عمل بیکار ہیں۔ تو مراد اس سے وہ عمل ہیں جن پر ان کو بوجہ خدمت خانہ کعبہ فخر تھا۔ فرمایا کہ یہ عمل کچھ کام نہیں دے سکتا۔ جب شرک و

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۹

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کا آباد کرنا اس کی طرح ٹھہرایا ہے جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اللہ کے ہاں وہ برابر نہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (1274)

وقف لازم

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝۲۰

جو ایمان لاتے ہیں اور ہجرت کرتے ہیں اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اللہ کے ہاں بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں اور وہی بامراد ہوں گے۔

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝۲۱ۙ

اُن کا رب اُن کو اپنی رحمت اور رضا اور باغوں کی خوش خبری دیتا ہے اُن کے لیے اُن میں ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہوں گی۔ (1275)

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۲۲

اُنہی میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔

کفر میں مبتلا ہیں تو خانہ کعبہ کی خدمت یا خانہ کعبہ کا حج کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ خانہ کعبہ کی تولیت کسی مشرک یا کافر قوم کے سپرد نہیں ہو سکتی۔

1274 - یعنی چھوٹے چھوٹے فیاضی کے کام اور جہاد فی سبیل اللہ جیسا عظیم الشان کام جو کہ حق کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے پوری جدوجہد کرنے کا نام ہے یکساں نہیں۔ اس کا شان نزول سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کا جنگ بدر میں قید ہو کر آنا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر فخر کرنا صحیح نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اس کا نزول 9 ہجری کا ہے۔

1275 - اللہ کی رحمت اور اس کی رضا جنت کی وہ عظیم الشان نعماء ہیں جن کا ذکر دوسری ساری نعماء سے الگ کیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ، اگر وہ ایمان پر کفر کو دوست رکھیں اور جو کوئی تم میں سے اُن کو دوست بنائے گا، تو یہی ظالم ہیں۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾ ع

کہہ دے اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے کنبے اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور مکان جن کو تم پسند کرتے ہو۔ تمہارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔[1276]

1276 - اس آیت میں مسلمانوں کی قومی زندگی کا ایک اصول بیان کیا ہے جس کو آج مسلمانوں نے یہاں تک بھلا رکھا ہے کہ ایک مترجم قرآن نے اپنے ترجمہ کے حاشیہ پر لکھ دیا ہے کہ یہ حکم ابتدائی زمانہ کے مسلمانوں کے لیے تھا ہمارے لیے نہیں۔ گویا یہاں تک اس حالت سے جو ان کی اصل زندگی کا موجب ہوئی تھی دور پڑ گئے ہیں کہ اب وہ اس اصول کو قابل عمل ہی نہیں سمجھتے۔ اس آیت کی رو سے مسلمانوں کو اس سے منع نہیں کیا گیا کہ وہ اپنے عزیزوں اور قریبیوں سے تعلق رکھیں یا مال کمائیں یا تجارتیں کریں یا بڑے بڑے مکانات بنائیں بلکہ ان کے سارے تعلقات دنیا کا ذکر کیا۔ ان کی ایسی تجارتوں کا ذکر کیا جن سے ذرا توجہ اِدھر اُدھر ہو تو مندی پڑ جائیں۔ ان کے بڑے بڑے محلات و مکانات کا ذکر کیا۔ یہ سب کچھ مسلمان رکھیں، اس کے لیے کوشش کریں مگر اصول یہ رکھیں کہ یہ چیزیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد سے زیادہ پیاری نہ ہوں یعنی اگر خدا کے لیے ان کو قربان کرنے کی ضرورت پڑے تو قربان کر دیں، حق کے قبول کرنے یا پھیلانے میں تعلقات رشتہ داری چھوڑنے پڑتے ہیں تو چھوڑیں، مال برباد ہوتے ہیں تو ہوں، تجارت جاتی ہے تو جائے۔ غرض ان چیزوں کو اسلام پر قربان کرنے کے لیے تیار رہیں۔ اسی آیت قرآنی کا ہی خلاصہ ہے جو اس صدی کے مجدد نے اپنے ساتھیوں سے یہ اقرار لیا ہے: **''میں دین کو دنیا پر مقدم کروں گا۔''** یہ سب چیزیں وسائل میں داخل ہیں مگر خدا اور اس کا رسول اصل غرض ہیں۔ وسائل کو

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۚ﴿۲۵﴾

یقیناً اللہ نے تمہیں بہت سے میدانوں میں مدد دی اور حنین کے دن جب تمہاری کثرت تمہیں اچھی لگی، پھر وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی، اور تم پر زمین باوجود فراخی کے تنگ ہوگئی تب تم پیٹھ دیتے ہوئے پھر گئے۔(1277)

حصول غرض کے لیے قربان کرنا ضروری ہے۔ آخر پر فرمایا کہ اگر ایسا نہ کرو گے، اگر انہی چیزوں کو تم اصل غرض زندگی بنالو گے تو پھر تمہارے ساتھ فاسقوں والا معاملہ ہوگا۔

1277 - مَوَاطِنَ۔ مَوْطِنٌ کی جمع ہے اور وَطَنٌ وہ جگہ ہے جہاں انسان اقامت رکھتا ہے اسے مَوْطِن بھی کہا جاتا ہے اور اس سے مراد لڑائی کا میدان بھی لیا جاتا ہے۔(ل)

جنگ حنین:

حنین مکہ اور طائف کے درمیان وادی ہے۔ مکہ سے صرف تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ مکہ کو فتح کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو خبریں پہنچیں کہ ہوازن اور ثقیف مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس لیے آپ نے مناسب سمجھا کہ قبل اس کے کہ وہ زور پکڑیں اس شورش کو دبا دیا جائے۔ چنانچہ آپ اسی دس ہزار جمعیت کے ساتھ جس کو لے کر مکہ فتح کیا تھا اور جس میں اب دو ہزار طلقاء مل کر کل تعداد بارہ ہزار ہوگئی تھی باہر نکلے۔ مسلمانوں کو اپنی کثرت پر فخر ہوا، بالمقابل دشمن صرف چار ہزار تھے۔ ہوازن اور ثقیف مشہور تیر انداز تھے اور پہاڑوں کے تنگ رستوں پر قابض تھے۔ پہلے حملہ میں ہی مسلمانوں پر اس قدر زور سے تیروں کی بوچھاڑ ہوئی کہ جو فوج آگے بڑھی تھی اور جس میں اکثر طلقا تھے اس نے پیٹھ پھیر لی۔ اس کا اثر پچھلی فوج پر پڑا اور آن کی آن میں بارہ ہزار کی فوج بھاگ اٹھی۔ قدرت خداوندی کا نظارہ تھا، مگر نبی کریم ﷺ اپنی خچر پر سوار اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ آپ کی رکاب پکڑے ہوئے برابر دشمن کی طرف بڑھے جا رہے تھے اور بلند آواز سے یوں پکار رہے تھے: [أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ] (صحيح البخاری، كتاب الجهاد، باب مَنْ قَادَ دَابَّةَ غَيْرِهِ فِي الْحَرْبِ، حديث: 2864) میں نبی ہوں کوئی جھوٹ نہیں میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔ یہ ہمت اور **شجاعت کا نظارہ** ایسا نہ تھا کہ بے اثر رہتا۔ تھوڑی ہی دیر میں لوگ آپ کے گرد جمع ہونا شروع ہوئے اور آہستہ آہستہ ساری فوج کا رخ پلٹا اور دوبارہ حملہ کر کے دشمن کو شکست دی۔ زمین کے تنگ ہونے سے مراد وہی پسپائی کی حالت ہے جب بھاگنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ یہاں اس گزشتہ واقعہ کا ذکر اس لحاظ سے کیا کہ مسلمان متنبہ رہیں کہ ان کے لیے فتح وظفر کا موجب نصرت الٰہی ہے نہ ان کی کثرت۔ وہ اپنی کثرت پر کبھی نازاں نہ ہوں۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَ عَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾

تب اللہ نے اپنی تسکین اپنے رسول پر اور مومنوں پر نازل کی اور وہ لشکر اتارے جن کو تم نہیں دیکھتے تھے اور ان کو جو کافر تھے عذاب دیا اور یہی کافروں کی سزا ہے۔ (1278)

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾

پھر اللہ اس کے بعد جس پر چاہے رجوع برحمت کرے اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَ اِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! مشرک ضرور پلید ہیں۔ سو اپنے اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے پاس نہ آئیں۔ (1279) اور اگر تم کو مفلسی کا ڈر ہو

1278 - ﴿جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا﴾ ملائکہ کی نصرت ہے اور لَّمْ تَرَوْهَا ان کو تم نے دیکھا نہیں ثابت کرتا ہے کہ **ملائکہ کا نزول جو جنگوں میں ہوا وہ آنکھوں سے نہیں دیکھا گیا۔** ہاں کسی صحابی نے کشفی نظر سے دیکھ لیا ہو تو الگ بات ہے۔

1279 - نَجَسٌ۔ نَجَاسَةٌ پلیدی کو کہتے ہیں۔ وہ بھی جو حاسہ سے معلوم ہو یعنی جسمانی پلیدی اور وہ بھی جو بصیرت سے معلوم ہو یعنی باطنی ناپاکی۔ (غ) اور یہاں مراد روحانی نجاست ہے اور مبالغہ کے لیے اسم کو استعمال کیا ہے۔ گویا عین نجاست ہیں۔ مراد یہ نہیں کہ ان کے جسم پلید ہیں ان سے مسجد حرام پلید ہو جائے گی، بلکہ ان کے عقائد اور شرک ناپاک ہیں اور مسجد حرام کو اللہ تعالیٰ نے توحید کا پاک نشان بنایا ہے۔

مسجد حرام میں مشرکوں کے آنے کو روک دیا

اس لیے کوئی غیر مسلم حدود حرم میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور یہ حکم حج سے مخصوص نہیں بلکہ عام ہے یعنی کسی وقت بھی غیر مسلم حدود حرم میں داخل نہ ہو۔ اور مشرک کے لفظ میں ہر غیر مسلم اس لیے داخل ہے کہ توحید کا مذہب سوائے اسلام کے کوئی نہیں رہا۔ یہ حکم ہر ایک مسجد کے لیے نہیں بلکہ خاص مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ کے لیے ہے اور اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ تا اسلام کا یہ مرکز غیر مسلموں کے تصرف میں نہ آنے پائے۔ بلکہ یہ امر کمال علم الٰہی پر دلالت کرتا ہے کہ ان حالات کا انکشاف آنحضرت ﷺ پر کیا جو تیرہ سو سال بعد دنیا میں پیدا ہونے والے تھے کہ غیر مسلم طاقتیں مسلمانوں کے ملکوں میں تھوڑی تھوڑی آمد و رفت کرتے کرتے پھر تدریجاً کچھ رسوخ حاصل کرتے کرتے آخر ان ممالک پر متصرف ہو جائیں گی اس لیے عالم الغیب اور حکیم خدا نے

فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۸﴾

تو اللہ اگر چاہے گا تم کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔ اللہ علم والا حکمت والا ہے۔ (1280)

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ ع 4 5 10

ان سے جنگ کرو جو اللہ پر ایمان نہیں لائے اور نہ پچھلے دن پر اور نہ ہی ان چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیں اور نہ سچے دین کو اختیار کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ محکوم ہوں۔ (1281)

(جیسا کہ آخری الفاظ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ میں اشارہ کیا) اپنے کامل علم وحکمت سے حدود حرم کو جو اسلام کا مرکز ہے غیر مسلموں کے دخول سے پاک رکھا۔ ہاں یہ حکم مسلمانوں کو دیا ہے جس میں یہ بھی بتا دیا کہ بادشاہت اس ملک کی تمہارے ہی ہاتھ میں رہے گی اور تم اس امر کے بجالانے پر قادر ہو گے۔

1280 - **مکہ کے لیے فقر کی بے خوفی کی بشارت:** عَيْلَةٌ کے معنی فقر ہیں اور عَالَ کے معنی فقیر ہو گیا ﴿وَ وَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ﴿۸﴾﴾ [الضحیٰ: 8:93] ''اور تجھے تنگ دست پایا تو غنی کر دیا۔'' مفلسی کے خوف کا ذکر اس لیے کیا کہ مکہ تو خود ﴿بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ﴾ میں تھا۔ تجارت سے اس کی ساری رونق تھی۔ بالخصوص حج کے موسم میں تجارتی مال دور دور سے لوگ ساتھ لاتے تھے اور اہل مکہ کو بیٹھے بٹھائے تجارت سے نفع حاصل ہوتا تھا۔ سو فرمایا کہ یہ خوف مت کرو۔ اللہ تعالیٰ اس کے سامان اپنے فضل سے پیدا کر دے گا۔ وہ فضل کے سامان یہ تھے کہ سارے ملک عرب کو مسلمان کر دیا بلکہ سارے عالم میں اسلام کو پھیلا دیا۔

1281 - اَلْجِزْيَةَ یہ لفظ جزا سے نکلا ہے جس کے معنی بدلہ ہیں۔ اس لیے جزیہ کسی چیز کا بدلہ ہے [وَتَسْمِيَتُهَا بِذٰلِكَ لِلْاِجْتِزَآءِ بِهَا فِيْ حَقْنِ دَمِهِمْ]۔ (غ) یعنی اس کا نام جزیہ اس لیے رکھا گیا کہ یہ ان کی جانوں کی حفاظت کا بدلہ ہے جن سے لیا جاتا ہے۔ **گویا جزیہ ایک ٹیکس ہے جو غیر مسلموں سے اخراجات حفاظت ملک کے بدلہ میں لیا جاتا ہے۔** جس حفاظت کے لیے مسلمان اپنی جان دیتا ہے دوسرے سے صرف ایک قلیل رقم لی جاتی ہے۔ جب مسلمان کسی دوسری قوم پر حکومت کریں گے تو لازماً ان کے جان و مال کی حفاظت وہ کریں گے کیونکہ حفاظت کا کام حکومت کے سپرد ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی دشمن سے بھی ان کی حفاظت کریں گے۔ اس کے عوض ان سے ایک رقم لے لی جاتی تھی جو اس حفاظت کا معاوضہ ہو جاتی تھی۔ اسی کو جزیہ کہا جاتا ہے اور یہ امر کہ یہ صرف حفاظت کا بدلہ ہے اس سے ظاہر ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب اسلامی فوجیں حمص سے جو شام میں واقع ہے ہٹ آئیں تو سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے وہاں کے یہودیوں اور عیسائیوں کو بلا کر کئی لاکھ کی رقم جزیہ سب واپس کر دی کہ اب ہم

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ اور یہودی کہتے ہیں عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں

چونکہ تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے اس لیے یہ رقم ہم نہیں رکھ سکتے اور ایسا ہی اضلاع میں لکھ دیا کہ جہاں سے اسلامی لشکر ہٹ آئے وہاں کی رقم جزیہ واپس کر دی جائے۔

عَنْ يَّدٍ ۔ یَدٌ کے معنی ہاتھ اور مجازاً قوت کے معنی میں آتا ہے۔تو مراد ہوئی قوت کی وجہ سے یعنی مسلمانوں کے ان پر غالب ہونے کی وجہ سے اور راغب نے اس کے معنی کیے ہیں[عَنْ مُقَابَلَةِ نِعْمَةٍ عَلَيْهِمْ فِيْ مَقَارَتِهِمْ] یعنی اس نعمت کے مقابل پر جو ان کو آرام دیا جانے سے ملی اور بعض نے عَنْ يَّدٍ کے معنی عَنْ غِنًى کیے ہیں یعنی غنی ہونے کی حالت میں جزیہ دیں۔اس لیے کہ فقیر عاجز سے جزیہ نہیں لیا جاتا۔(د) یہ معنی اس لیے قابل ترجیح ہیں کہ محکومیت کا مفہوم صٰغِرُوْنَ میں آجاتا ہے۔

صٰغِرُوْنَ ۔ صَاغِرٌ کے معنی راغب نے لکھے ہیں جو چھوٹے مرتبہ پر راضی ہو۔پس مراد حالت محکومیت ہے۔

اہل کتاب کے ساتھ جنگ کے احکام:

یہ آیت مضمون سابق کے لیے بطور تتمہ کے ہے۔قرآن کریم میں اور بالخصوص اس سورت میں جس قدر احکام جنگ کے متعلق اب تک آئے ہیں وہ سب مشرکوں کے متعلق ہیں اور یہ خیال ہوسکتا تھا کہ شاید سوائے مشرکوں کے مسلمانوں کو دوسروں سے جنگ کی ضرورت ہی کبھی پیش نہ آئے گی۔اس لیے اہل کتاب کا نام بھی یہاں لے دیا ہے اور منشا صرف اس قدر ہے کہ جن حالات میں مشرکوں سے جنگ کی اجازت یا حکم دیا ہے انہی حالات میں اہل کتاب سے بھی جنگ جائز ہے اور اہل کتاب کا نقشہ جو کھینچا ہے تو اس میں بھی بتایا ہے کہ یہ مذہب حق سے جن پر ان کو قائم کیا گیا تھا بالکل گر گئے ہیں۔جس کی تفصیل اگلے رکوع میں آئے گی۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہاں قَاتِلُوا کا حکم ہے اور مُقَاتِلَةٌ میں دو فریق ہوتے ہیں اِقْتُلُوْا کا حکم نہیں کہ انہیں قتل کرنے کا اختیار ہو اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے قتال پر جو حد بندی وارد ہو چکی ہے وہ اہل کتاب کی صورت میں باطل نہیں ہو جاتی۔ اور وہ یہ ہے ﴿وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا﴾[البقرة: 190:2] یعنی جنگ صرف ان لوگوں کے ساتھ ہو جو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور پھر ضرورت جنگ سے نہ بڑھیں۔

کیا نبی کریم ﷺ کا عمل اس کے مطابق تھا یا نہیں؟ رومن امپائر عرب کے شمال میں لگتی تھی اور آپ کو خبر پہنچی کہ یہ لوگ عرب پر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔آپ نے فوراً تیس ہزار کی فوج جمع کی اور عرب کی شمالی سرحد پر پہنچ گئے۔یہ غزوہ تبوک ہے جس کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔مگر وہاں آپ نے مقابلہ کے لیے کوئی لشکر تیار نہ پایا۔اب اگر اہل کتاب سے جنگ کرنے کا حکم مشروط نہ ہوتا تو ظاہر تھا کہ حکم بھی موجود ہے، فوج بھی موجود ہے، مقابل میں تیاری نہ ہونے سے کامیابی کی امید بھی بہت زیادہ ہے۔مگر نبی کریم ﷺ نے کیا کیا؟ بغیر جنگ کے واپس آئے۔کیوں؟ اس لیے کہ ﴿الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ کی شرط پوری نہ ہوئی

النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۳۰

مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں[1282] یہ ان کی بات کی نقل کرتے ہیں جو پہلے کافر ہوئے۔ اللہ ان کو ہلاک کرے کہاں سے الٹے پھرے جاتے ہیں۔[1283]

تھی۔ پس الفاظ قرآنی اور عمل نبی کریم ﷺ دونوں اس پر شاہد ہیں کہ اہل کتاب سے جنگ بھی اسی طرح مشروط ہے جس طرح مشرکوں سے۔

ہاں یہاں یہ فرمایا کہ اہل کتاب یعنی دوسرے مذاہب تو ہمیشہ رہیں گے عرب کی بت پرستی کی طرح نابود نہ ہو جائیں گے۔ اس لیے فرمایا کہ جنگ ان سے کرنی پڑے اور وہ جزیہ قبول کریں تو جنگ مت کرو اور جزیہ کے لینے میں جو حاکم کا کام ہے اور ان کے لیے لفظ صَاغِرٌ اختیار کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اہل کتاب کے ساتھ جنگوں میں مسلمان کامیاب ہوں گے اور اہل کتاب مغلوب ہوں گے۔

1282 - اہل کتاب کے ساتھ جنگوں کا ذکر کیا تو بتا دیا کہ یہ لوگ بھی اسلام کی کامیابی کو نہیں چاہتے۔ اور اس کے خلاف کوشش کرتے ہیں۔ مگر اسلام آخر کار غالب ہوگا۔ مگر اصل مضمون سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کی غلطیوں کا کچھ ذکر کیا ہے۔

حضرت عزیرؑ:

عزیر علیہ السلام یا عزرا یہودیوں میں ایک بڑے عظیم الشان نبی گزرے ہیں۔ علمائے طالمود نے ان کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز بیان کیے ہیں۔ یہاں تک کہ یہودی انسائیکلو پیڈیا میں ہے بعض نے کہا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام پر شریعت نازل نہ ہوئی ہوتی تو عزیر پر نازل ہوتی۔ ممکن ہے اس زمانہ میں یہودیوں کی قوم اس قسم کے بیانات کی وجہ سے اور عیسائیوں کے مقابل میں آ کر سچ مچ عزیر کو ابن اللہ کہنے لگی ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں جس قدر مباحثات یہود کے ساتھ ہیں ان میں ان کو براہ راست یہ الزام نہیں دیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کہ ابن اللہ ہونے کا عقیدہ اگر فی الواقع ان میں تھا تو ساری قوم کا نہ تھا۔ کسی ایک شاخ کا ہوگا اور یا ممکن ہے کہ یہاں ابن اللہ کا استعمال اسی معنی میں ہوا ہو۔ جیسے دوسری جگہ ہے ﴿وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ﴾ [المآئدۃ: 18:5] اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ جہاں ﴿اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ﴾ کا لفظ مجازاً استعمال ہوا ہے اور مطلب صرف یہی ہے کہ اس کے لیے ایسے پیارے ہیں جیسے باپ کو بیٹا پیارا ہوتا ہے۔ اسی طرح عزیر کو ابن اللہ کہنے سے مراد یہی ہو کہ وہ ان کی عزت ان کے اصل مرتبہ سے بڑھ کر کرتے ہیں۔

1283 - يُضَاهِـُٔوْنَ۔ ضَاهٰى بغیر ہمزہ کے اور ہمزہ کے ساتھ دونوں طرح آیا ہے اور اس کے معنی ہیں مشابہت اختیار کی۔ (غ)

قٰتَلَهُمُ کے معنی بعض نے کیے ہیں اللہ ان پر لعنت کرے اور بعض نے اللہ ان کو قتل کرے۔ راغب کہتے ہیں درست یہ ہے کہ یہ

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾

انہوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ کے سوائے رب بنالیا ہے اور مسیح ابن مریم کو اور ان کو سوائے اس کے کچھ حکم نہ دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں اس کے سوائے کوئی معبود نہیں، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ (1284)

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنے مونہوں سے بجھا دیں اور اللہ کو کچھ منظور نہیں مگر یہی کہ اپنے نور کو پورا کرے

باب مفاعلۃ سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ گویا ایسا شخص اللہ کے ساتھ جنگ کا قصد کرتا ہے اور جو اللہ کے ساتھ مقابلہ کرے گا وہ مغلوب ہوگا۔

ان الفاظ میں ایک ایسی بات کی خبر دی ہے جس کی اطلاع آج دنیا کو ہوئی ہے یعنی یہ کہ **عیسائیوں نے خدا کا بیٹا تجویز کرنے میں پہلی کافر قوموں کی نقل کی ہے۔** آج یونانیوں اور رومیوں کے مذاہب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فی الواقع یہ خدا کا بیٹا بنانے کا عقیدہ ان میں مروج تھا اور وہیں سے پولوس نے اس کو لیا۔ کیونکہ جب اس نے دیکھا کہ یہودی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قبول نہیں کرتے تو اس نے حضرت مسیح کے بعض الفاظ کو جو مجاز اور استعارہ کے طور پر تھے حقیقت پر محمول کر کے اور اصل بنائے مذہب قرار دے کر بت پرستی سے ملتا جلتا ایک مذہب بنا دیا جس کی وجہ سے غیر یہودی اقوام کا میلان عیسائیت کی طرف بہت ہوگیا۔ یہی الزام قرآن شریف نے دیا ہے کہ عیسائیوں کا مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینا ان کی ایجاد نہیں بلکہ پہلی کافر قوموں کی ریس کر کے یہ مذہب بنالیا ہے۔ یوں تو عرب کے لوگ بھی خدا کی طرف بیٹیاں منسوب کرتے تھے۔ مگر ﴿مِّنْ قَبْلُ﴾ کا لفظ بڑھا کر یہ صاف کر دیا کہ قرآن کریم کی مراد عیسائیت سے پہلی کافر قومیں ہیں۔

1284 - اَرْبَابٌ۔ رَبٌّ کی جمع ہے [دیکھو نمبر: 2]۔ جب کسی کی اطاعت میں غلو کیا جائے تو اسے بھی معبود یا رب ہی کہہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ عدی بن حاتم سے روایت ہے کہ انہوں نے اس آیت کے نزول پر رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! لوگ احبار و رہبان کی عبادت تو نہ کرتے تھے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا ایسا نہیں کہ جو اللہ نے حلال کیا ہے اسے وہ حرام کہہ دیتے تو لوگ بھی اسے حرام سمجھ لیتے اور جو اللہ نے حرام کیا ہے اسے حلال کہہ دیتے تو لوگ بھی اسے حلال سمجھ لیتے۔ مسیح ابن مریم علیہما السلام کا نام الگ لینے سے بالخصوص عیسائیوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جن کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔ **اس معیار پر آج مسلمانوں میں جس قدر گدیاں ہیں الا ماشاء اللہ ان سب کو ان کے مرید** ﴿اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ سے کم نہیں سمجھتے۔ کیونکہ جو کچھ پیر کہہ دے

وَ لَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۳۲﴾ گو کافر براہی مانیں۔(1285)

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ۙ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳۳﴾ النصف

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو کل دینوں پر غالب کرے گو مشرک براہی مانیں۔(1286)

اس کے مقابل شریعت کی پروا بھی نہیں کی جاتی۔

1285 - نُوۡرَ اللّٰهِ سے مراد نبوت محمدیہ ہے یا دین اسلام۔ بِاَفۡوَاهِهِمۡ سے مراد ان کے اقوال باطلہ ہیں جن کے ساتھ دلیل کوئی نہیں۔

اس آیت میں ایک طرف تو یہ بتایا کہ عیسائیوں کے کیا کیا منصوبے اسلام کے خلاف ہیں اور وہ کس طرح اسلام کے نیست و نابود کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور دوسری طرف نہایت پرزور الفاظ میں یہ خبر ہے کہ دین اسلام کامل ہو کر رہے گا۔

1286 - یُظۡهِرَ۔ ظَهۡرٌ کے معنی پیٹھ ہیں اور سواری کو بھی کہتے ہیں اور بطور استعارہ اس پر بھی بولا جاتا ہے جس سے قوت ملے۔ اور [ظَهَرَ عَلَیۡهِ] کے معنی ہیں غَلَبَهٗ یعنی اس پر غالب آ گیا۔ اسی سے یُظۡهِرُ غالب کرنے کے معنی میں ہے۔ (غ)

یہ دوسری خوش خبری ہے۔ پہلی آیت میں تو یہ بتایا تھا کہ دین اسلام کو یہ نیست و نابود نہیں کر سکیں گے۔ اب فرمایا کہ یہی نہیں بلکہ یہ دین کل ادیان پر غالب کر دیا جائے گا عیسائی اس بات پر خوش ہو رہے ہیں کہ اب اسلام کی حکومت دنیا سے اُٹھ گئی اس لیے اب عیسائیت غالب آ جائے گی۔ لیکن اہل نظر دیکھ سکتے ہیں کہ اسلام کی حکومت باوجود مسلمانوں کی محکومی کے دنیا پر بڑھ رہی ہے۔ اسلام کی حکومت پہلے بھی دلوں پر تھی، اب بھی دلوں پر ہے۔ ہاں مسلمانوں کو حکومت دے دی گئی تھی کیونکہ اس وقت بغیر اسلامی حکومت کے اسلام کا پھیلنا ناممکن تھا۔

عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ:

اب بغیر مسلمانوں کی حکومت کے بھی اسلام پھیل سکتا ہے اور چونکہ عیسائیوں کا یہ اعتراض اسلام پر تھا کہ مسلمانوں کی حکومت کی وجہ سے ابتدا میں اسلام پھیل گیا اور بزور شمشیر پھیلا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری قوم کے ہاتھ میں حکومت اور تلوار دے کر ان کو اس بات پر بھی آمادہ کر دیا ہے کہ وہ سارا زور اسلام کے خلاف لگا لیں بالآخر حق ہی غالب ہوگا۔ چنانچہ ایک طرف اگر اسلامی حکومتیں گرتی جاتی ہیں تو دوسری طرف اصول اسلام غالب آتے چلے جاتے ہیں۔ توحید اسلامی، مساوات نسل انسانی جس کی تعلیم اسلام نے دی اگر ایک طرف روز بروز ترقی کر رہے ہیں تو دوسری طرف تثلیث و کفارہ کے اصول خود بخود پگھلتے چلے جاتے ہیں۔ ساری دنیا پر عیسائیت کی حکومت ظاہری کے باوجود اس کی حکومت باطنی گر گئی اور مسلمانوں کی محکومیت کے باوجود اسلام کی حکومت باطنی مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یقیناً بہت سے علماء اور راہب لوگوں کے مال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے۔ (1287)

اکثر مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ اظہار دین اس امت میں مسیح موعود کے ظہور کے بعد ہوگا۔ (ج) البتہ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اظہار اسلام سے مراد کل دینوں کا ہلاک ہو جانا ہے۔ بلکہ غلبہ یا اظہار کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ دوسرے دین بھی رہیں گے مگر غالب دین اسلام ہوگا۔ اس زمانہ میں دین عیسوی کے عقائد خود بخود اس طرح دلوں سے نکلتے چلے جاتے ہیں اور خود عیسائی ان سے اس طرح بیزار ہو رہے ہیں اور دوسری طرف عقائد حقہ اسلامیہ کی قبولیت یوں خود بخود بڑھتی جاتی ہے کہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ مسیح کا زمانہ آ چکا ہے۔

1287 - اس آیت میں اول **علماء و مشائخ کے مال وزر باالباطل کھانے کا ذکر ہے۔** لکھا ہے کہ اس زمانہ میں علمائے یہود و نصاریٰ عوام کالانعام کو اس طرح دھوکہ دے کر ان کا مال کھاتے تھے کہ ہم کو راضی کر لو گے تو اللہ راضی ہو جائے گا اور رشوتیں لے کر فتویٰ دیتے تھے۔ مگر یہ یہود و نصاریٰ کے علماء تک محدود نہیں بلکہ ان کے ذکر میں مسلمانوں کو سمجھایا ہے۔ چنانچہ ہمارے اس زمانہ میں اکثر علماء مشائخ کی یہی حالت ہے کہ وہ بھی اپنی رضا میں خدا کی رضا بتاتے ہیں۔ یہی لوگ پھر اللہ کی راہ سے روکنے والے بھی ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ذاتی اغراض درمیان میں آ جاتی ہیں۔ اور یہ لوگ حق کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہود و نصاریٰ کے علماء آنحضرت ﷺ کے دشمن ہو گئے تھے۔ اور آج بھی علماء و مشائخ نے اس حق کی مخالفت کی جو ایک مجدد کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمایا تھا اور جس نے سوائے خدمت دین اسلام کے اور کسی طرف نہیں بلایا۔

سونے اور چاندی کے جمع کرنے سے کیا مراد ہے؟ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اس بارہ میں یہاں تک مبالغہ کیا کہ ان کے نزدیک سونے چاندی کا گھر میں رکھنا ہی منع تھا۔ اس بارہ میں ان کا صحابہ رضی اللہ عنہم سے اختلاف بھی سخت تھا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ کعب رضی اللہ عنہ کے پیچھے ڈنڈا لے کر دوڑے اور انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر پناہ لی جس کی وجہ سے آخر کار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حکم دینا پڑا کہ وہ ربذہ میں جا رہیں تا کہ فساد نہ ہو۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ خیال درست نہیں۔ اس لیے کہ پھر زکوٰۃ کس چیز پر ہے؟ اور وراثت کی تقسیم کا کیا مطلب ہے؟ خود نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''مال کو پاک کرنے کے لیے زکوٰۃ فرض کی گئی ہے۔'' پس مال کی وہی محبت بری ہے جب انسان اللہ کی راہ میں کچھ صرف نہ کرے۔ یا غربا کا اس

يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾

جس دن اس مال کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس کے ساتھ ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی یہ وہ ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا سو (اس کا مزہ) چکھو جو تم جمع کرتے تھے۔ (1288)

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ

مہینوں کی گنتی اللہ (تعالیٰ) کے نزدیک اللہ کے حکم میں بارہ مہینے ہے جس دن آسمان اور زمین پیدا کیے۔

میں کچھ حق نہ سمجھے۔ مال کے جمع کرنے کے بارہ میں افراط وتفریط دونوں راہوں سے بچنا چاہیے۔ آج اگر ایک طرف مال کے چند افراد کے ہاتھ میں جمع ہونے سے یورپ میں مصائب پیش آ رہے ہیں تو ان کے بالمقابل بولشویکوں کا گروہ پیدا ہو گیا ہے جنہوں نے تفریط کی راہ اختیار کی ہے۔ اسلام کی تعلیم اعلیٰ درجہ کے اقتصاد اور میانہ روی کی ہے۔ مال بھی جمع کرو مگر غربا کا حصہ دیتے رہو اور ملامت ان لوگوں کو کی ہے جو مال جمع کرتے ہیں۔ پھر اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے صرف جمع کرنے والوں کو ملامت نہیں۔

1288 - يُحْمٰى۔ حَمِيَ وہ حرارت ہے جو گرم جوہر سے پیدا ہوتی ہے جیسے آگ اور سورج اور وہ بھی جو بدن میں قوت حارہ سے پیدا ہوتی ہے اور قوت غضبیہ جب جوش میں آئے تو اسے حَمِيَّةً کہا جاتا ہے ﴿حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ [الفتح: 26:48] ''ضد جاہلیت کی۔''

تُكْوٰى۔ كَوٰى جانور کے داغ دینے پر بولا جاتا ہے اور مصدر كَيٌّ ہے۔

جِبَاهُهُمْ۔ جَبْهَةٌ ماتھے کو کہا جاتا ہے۔ وہ جگہ جو سر میں سے سجدہ میں زمین پر لگتی ہے۔

جُنُوْبُ۔ جَنَبٌ کی جمع ہے کروٹ یا پہلو۔

پیشانی وغیرہ کا داغا جانا:

آخرت کی سزا کا ذکر عموماً انہی الفاظ میں ہوتا ہے جس قسم کی بدی ہو۔ انسان مال جمع کر کے اس سے دوسروں پر وجاہت قائم کرتا ہے اور دوسروں سے متکبرانہ پیش آتا ہے اور حاجتمندوں پر پیٹھ پھیر لیتا ہے۔ اس لیے وہ پیشانی جس سے وہ اظہار فخر کرتا ہے اور وہ پہلو جو وہ بوجہ تکبر پھیر لیتا ہے ﴿وَ اِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ﴾ [بنی إسرائیل: 83:17] ''اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں تو وہ منہ پھیر لیتا ہے۔'' اور وہ پیٹھ جو وہ حاجت مند پر پھیرتا ہے سب محل سزا ہو جاتے ہیں اور یوں سزا بھی محیط ہو جاتی ہے کہ سامنے پیشانی پر اور کروٹ پر اور پیٹھ پر سب طرف اس کا اثر ہے۔ دولت کا نرا جمع کرتے جانا اور اس کا خدا کی راہ میں خرچ نہ کرنا اس دنیا میں بھی دکھ کا موجب بن جاتا ہے اور وہ سکھ جو انسان اس سے چاہتا ہے حاصل نہیں ہوتا۔

السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ۬ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۶

ان میں سے چار حرمت والے ہیں یہ دین مضبوط ہے۔ سو ان میں اپنے اوپر ظلم مت کرو اور مشرکوں سے سب کے سب جنگ کرو، جس طرح وہ تم سے سب کے سب جنگ کرتے ہیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔ (1289)

اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ يُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ

مہینوں کا پیچھے کر دینا کفر کی ایک زیادتی ہے وہ جو کافر ہیں اس سے گمراہ ہوتے ہیں ایک سال اسے حلال قرار دیتے ہیں اور ایک سال اسے حرام قرار دیتے ہیں تاکہ ان (مہینوں) کی گنتی کے مطابق کر لیں جو اللہ نے حرام کیے ہیں اور یوں اللہ نے جو

1289 - اہل کتاب کا ذکر درمیان میں ضمنی طور پر آ گیا تھا۔ اصل مضمون مشرکین سے جنگ کا تھا۔ اور غزوہ تبوک اور منافقین کا ذکر شروع کرنے سے پہلے اسی اصل مضمون کی طرف عود کیا ہے۔ تو چونکہ جنگوں کا ذکر تھا اس لیے حرمت کے مہینے جن میں جنگ کرنا منع کیا گیا ہے ان کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مشرک لوگ نَسِیْء کے ذریعہ سے حرمت کے مہینوں کو بدلتے رہتے تھے۔ جس سے امن اٹھ جاتا تھا۔ چنانچہ خود اسی نویں سال میں حج ذیقعد میں ہوا تھا۔ اس لحاظ سے بھی کہ مشرکوں کے لیے یہ ایک اعلان تھا۔ یہ اطلاع ضروری تھی کہ آئندہ یہ تغیر و تبدل نہ ہوں گے۔ پس فرمایا کہ مہینے تو بارہ ہی ہیں اور پہلے دن سے ہی بارہ ہیں۔ چنانچہ سب قوموں میں **سال کے بارہ مہینے** ہی پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے **چار حرمت کے مہینے ہیں** جن کے بارہ میں اپنے آپ پر ظلم مت کرو، یعنی ان کے اندر جنگ مت کرو۔ اور اس کو یعنی حرمت کو تسلیم کرنے کو دین قیم کہا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک مضبوط اصول ہے جس سے جنگوں کے اندر قوموں کی زندگی وابستہ ہے اور یا دین یہاں بمعنی حساب ہے یعنی یہ حساب مضبوط ہے۔ اس سے شک و شبہ پیدا نہیں ہوتا۔

حرمت کے مہینوں کو قائم کر کے پھر فرمایا کہ مشرکوں کے ساتھ سب کے سب جنگ کرو، جس طرح وہ سب کے سب تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں۔ جس میں یہ اصول سمجھایا ہے کہ **دشمن کے مقابل میں سب مسلمانوں کو ایک رہنا چاہیے** جس طرح دشمن مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک ہو جاتے ہیں۔

اَعْمَالِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ ع 5 8 11

حرام کیا ہے اسے حلال کرلیں ان کو ان کے برے کام اچھے معلوم ہوتے ہیں اور اللہ کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔ (1290)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہیں کیا ہوا کہ جب تم کو کہا جائے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم بوجھل ہو کر زمین کی طرف جھک جاتے ہو کیا تم آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے ہو؟ سو دنیا کی زندگی کا سامان آخرت کے مقابلے میں تھوڑا ہی ہے۔ (1291)

1290 - نَسِیْٓءُ۔ نَسْءٌ کے معنی تاخیر کرنا یا پیچھے ڈال دینا ہیں۔ اور نَسِیْئَۃٌ حرمت والے مہینوں کا پیچھے ڈال دینا ہے۔ جو عرب لوگ کرتے تھے۔ (غ) بعض وقت یہ لوگ یوں کیا کرتے تھے کہ اگر جنگ ہو رہی ہو اور حرمت کا مہینہ آ جائے تو اسے پیچھے ڈال دیتے یعنی اس کی بجائے کسی پچھلے مہینہ کو حرمت والا قرار دے لیتے۔ **بعض اور اغراض** کے لیے بھی ایسا کر لیتے تھے۔ اس سے ناواقفوں کو بڑی تکلیف ہوتی تھی اس لیے نَسِیْء کو ناجائز قرار دیا گیا اور فرمایا کہ خدا کے حکم میں جب چار ماہ کی حرمت قرار دی گئی تو یہ نَسِیْء نہ تھی۔ یہ پیچھے کافروں نے اپنی اغراض کے لیے بنالی۔ اس لیے اب اس کو دور کیا جاتا ہے۔

1291 - انْفِرُوْا۔ نَفَرَ قرار پکڑنے کی ضد ہے۔ (ل) یا گھبرا کر ایک چیز سے ہٹ جانا یا ایک چیز کی طرف نکل پڑنا ﴿مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا﴾ [فاطر: 42:35] ''تو اس نے انہیں نفرت میں ہی بڑھایا'' اور جنگ میں نکلنے کو بھی نَفَرَ کہا جاتا ہے اور نَفَرَ اور نَفِیْر کئی آدمیوں کو کہتے ہیں گویا ان کے لیے باہر نکلنا ممکن ہے۔ (غ)

اِثَّاقَلْتُمْ۔ ثِقْلٌ۔ خِفَّۃٌ کے مقابلہ پر ہے اور اجسام اور معانی دونوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور ثقیل کا استعمال انسان میں اکثر ذم کے مقام پر ہوتا ہے کبھی مدح پر بھی اور چونکہ اجسام میں ثقیل وہ ہیں جن کا میلان نیچے کی طرف ہوتا ہے جیسے پتھر وغیرہ اور خفیف وہ جن کا میلان اوپر کی طرف ہو اس لیے اِثَّاقَلَ میں اشارہ یہاں پستی کی طرف جھک جانے کی طرف ہے۔ (غ) اور اس کا اصل [تَثَاقَلْتُمْ] ہے۔

یہاں سے **جنگ تبوک اور اس کے متعلق واقعات** کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ یہ مہم رجب 9 ہجری میں تیار ہوئی اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ نبی کریم ﷺ کو سلطنت روما کے متعلق یہ خبریں متواتر پہنچیں کہ وہ عرب پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ جنگ کے معاملہ میں آپ کا طریق نہایت احتیاط کا تھا۔ جب کبھی کسی قوم کی تیاری کی خبر آپ کو پہنچتی آپ فوراً اس کے انسداد کے لیے مہم روانہ کر دیتے تھے۔ اس موقعہ پر بھی متواتر خبروں کے پہنچنے پر آپ ﷺ نے تیاری کا حکم دیا۔ اس وقت مسلمانوں کے لیے بہت سی مشکلات

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾

اگر تم نہ نکلو تو وہ تم کو دردناک عذاب دے گا اور تمہاری جگہ دوسرے لوگ لے آئے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (1292)

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَ

اگر تم اس کی مدد نہ کرو تو یقیناً اللہ نے اس کی مدد کی جب اس کو ان لوگوں نے جو کافر تھے نکال دیا (اس حال میں کہ) وہ دو میں کا دوسرا تھا جب وہ دونوں غار میں تھے۔ جب اس نے اپنے رفیق کو کہا غمگین نہ ہو اللہ ہمارے ساتھ ہے، سو اللہ نے اپنی تسکین اس پر اتاری اور

کا سامنا تھا۔ اول تو ایام قحط تھے۔ دوسرے ملک شام کی حدود تک ایک بہت ہی لمبا سفر تھا اور راستہ میں پانی اور رسد وغیرہ کی قلت تھی۔ تیسرے فصل بالکل پختہ کاٹنے کے لیے تیار تھی اور اس حالت میں اس کو چھوڑنا بڑا مشکل تھا۔ چوتھے موسم سخت گرمی کا تھا اور پانچویں مقابلہ عرب کی کسی قوم سے نہ تھا بلکہ ایک منتظم سلطنت کی باقاعدہ فوجوں سے مقابلہ تھا جو ہر قسم کے سامان جنگ سے آراستہ تھیں اور روما اور ایران کی سلطنتوں سے عرب کے لوگ ہمیشہ خائف رہتے تھے کیونکہ ان کی طاقت کے سامنے عربوں کی طاقت ہیچ تھی۔ مگر باوجود ان مشکلات کے مسلمانوں نے نبی کریم ﷺ کی آواز پر لبیک کہا اور تیس ہزار آدمی آپ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور کسی نے مشکلات کی پروانہ کی۔ بلکہ جو لوگ تندرست تھے اور سواری کا انتظام ان کے لیے نہ ہو سکا وہ روتے ہوئے پیچھے رہے البتہ منافقوں کی تمیز کا یہ آخری موقعہ آ پہنچا تھا اور وہ طرح طرح کے عذر کر کے رہ گئے۔ یہ جنگ عیسائیوں سے تھی اور اس لیے اس کے ذکر سے پہلے اہل کتاب کے ساتھ جنگ کا ذکر بھی آ چکا ہے اور نبی کریم ﷺ کی جنگوں میں یہ سب سے آخری جنگ تھی۔ شاید یہ اشارہ تھا کہ آخر کار مسلمانوں کا مقابلہ عیسائیوں سے ہی رہ جائے گا۔ اور یہاں جو ﴿اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ﴾ کہا تو مطلب اس کا یہ نہیں کہ مومن زمین کی طرف جھک گئے تھے بلکہ یہ بطور حثّ ہے اور خطاب ان لوگوں سے ہے جو نرا منہ سے دعویٰ ایمان کرتے تھے جیسا کہ [آیت:40] میں ﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ﴾ سے ظاہر ہے کیونکہ مومن مدد کرنے والے تھے۔

1292 - یہ عذاب منافقین کو ہی ملا جس سے معلوم ہوا کہ یہاں خطاب منافقوں سے ہی ہے ﴿وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا﴾ یعنی جنگ کے لیے تمہارے نہ نکلنے سے اللہ تعالیٰ کا اور اس کے دین کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔

اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۴۰

اس کو ایسے لشکروں سے قوت دی جن کو تم نہ دیکھتے تھے اور ان لوگوں کی بات کو جو کافر تھے نیچا دکھایا اور اللہ کی بات ہی بلند ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (1293)

1293 - غَارَ۔ غَوْرَ سے ہے اور غَوْرٌ ہر چیز کی گہرائی کو کہتے ہیں۔ اور اسی سے پہاڑ کی غار ہے اور مَغَارٌ اور مَغَارَۃٌ بھی غار کی طرح ہے اور ﴿اَوْ مَغٰرٰتٍ﴾ [التوبة: 57:9] ''یا غاریں'' اور پانی کے بہت گہرائی میں چلے جانے پر بھی بولا جاتا ہے ﴿اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا﴾ [الملك:30:67] ''اگر تمہارا پانی زمین کے اندر چلا جائے'' اور اسی سے غَوْرٌ کسی چیز میں فکر کرنا ہے۔ (ل)

اس آیت میں مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کیسی کیسی مشکلات کے وقت میں اسلام کی نصرت کرتا رہا ہے اور نبی کریم ﷺ کی انتہائی بے کسی کا نقشہ کھینچ کر دکھایا ہے کہ مخالفین اسلام تو اس وقت بھی اسلام کو نیست و نابود نہ کر سکے تو اب مومنوں کو کیا خوف ہے جب اسلام اس قدر پھیل چکا ہے۔

وہ واقعہ جس کا یہاں ذکر ہے نبی کریم ﷺ کی مکہ سے مدینہ کو ہجرت کا واقع ہے جس کی طرف ﴿اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ میں اشارہ ہے یعنی کافروں کی وجہ سے آپ کو نکلنا پڑا۔ آپ کے قتل کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ قاتلوں کا جتھا آپ کے گھر کا محاصرہ کیے ہوئے کھڑا تھا۔ اس حالت میں آپ ان کے درمیان سے نکلتے ہیں اور سیدھے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچتے ہیں اور یہ دونوں ساتھی رات کی تاریکی میں نکلتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے سب صحابیوں رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ایک ایک کر کے اپنے سے پہلے رخصت کر دیا تھا۔ سوائے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے۔ ان میں سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ تو آپ کے بستر پر لیٹ رہے اور ان کے پیچھے رہنے کی غرض یہ تھی کہ امانتیں وغیرہ ادا کریں جو نبی کریم ﷺ کے ذمہ تھیں اور **سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آپ نے ہجرت میں ساتھی بنانے کے لیے چنا ہوا تھا۔** حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ سے بار بار درخواست کرتے رہتے تھے اور آپ فرماتے تھے ابھی ہجرت کی اجازت مجھے نہیں ملی۔ آخر وہ وقت آیا تو آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر نکلے جس کی طرف ﴿ثَانِيَ اثْنَيْنِ﴾ میں اشارہ ہے اور جو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی علو مرتبت پر شاہد ہے۔ تیسرا واقعہ ﴿اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾ کا بیان کیا ہے۔ یہ غار ثور ہے جو مکہ سے کوئی تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ رات کے وقت غار میں جا کر چھپنا کس قدر خطرات سے پُر ہے اور غار بھی نہایت بے آباد اور سنسان مقام میں جہاں انسان کا گزر نہیں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اس غار میں پہلے داخل ہوئے اور اس کے سارے سوراخوں وغیرہ کو بند کیا اور ہاتھ پھیر کر اندر سے صاف کیا۔ تب اس بات کا اطمینان کر کے کہ کوئی موذی جانور اندر نہیں نبی کریم ﷺ کو اندر داخل ہونے دیا اور اس تاریک پُرخطر جگہ میں یہ دونوں ساتھی چھپے۔ آخر کار دن چڑھا، کفار کو پتہ لگا ہر طرف تلاش شروع ہوئی، سراغ غار کے منہ تک پہنچا۔ ادھر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اوپر پاؤں کی آہٹ سنی تو آپ کو نہ اپنے لیے بلکہ اپنے پیارے رفیق کے لیے جس کی خاطر سب کچھ قربان کر رکھا تھا فکر ہوا کہ اب گریز کی کوئی جگہ نہیں۔ دو آدمی غار کے اندر ہیں اور دشمنوں کا جمگھٹا اس کے منہ پر۔ اس حالت میں وحی الٰہی کی تسکین کام دیتی ہے۔ ہم دو نہیں بلکہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ کیا عجب شان خداوندی ہے کہ

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

ہلکے اور بوجھل نکل پڑو اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ (1294)

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّ سَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَ لٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ

اگر فائدہ جلد ملنے والا اور سفر میانہ ہوتا تو ضرور تیرے پیچھے ہو لیتے لیکن مشقت کا سفر انہیں بہت دور معلوم ہوا۔ اور اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ ہم میں طاقت ہوتی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ نکلتے۔ اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ

ایک مکڑی غار کے منہ پر جالا تن دیتی ہے اور تلاش کرنے والے سراغ رسانی کرتے ہوئے غار کے منہ تک پہنچتے اور وہاں سے جالا دیکھ کر واپس ہو جاتے ہیں۔ مکڑی کا جالا جو ﴿اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ﴾ ہے وہ کام دے جاتا ہے جو ایسے اوقات میں بڑے بڑے مضبوط قلعے نہیں دے سکتے۔ یہ نصرت الٰہی کا نظارہ تھا۔

﴿اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا﴾ میں یا تو اشارہ اس وقت نزول ملائکہ کی طرف ہے جنہوں نے آنحضرت ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تسکین دی اور یا بعد میں جنگوں میں نزول ملائکہ کی طرف اشارہ ہے ﴿كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا﴾ یا کافروں کی بات یہ تھی کہ اسلام کو نیست و نابود کر دیا جائے گا ﴿كَلِمَةُ اللّٰهِ﴾ اسلام کے غلبہ کی پیشگوئیاں تھیں۔

خطاب ﴿ثَانِيَ اثْنَيْنِ﴾ میں ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت پر صریح دلیل ہے۔ اہل تشیع کو اس کی بڑی لچر تاویلیں کرنی پڑی ہیں اللہ تعالیٰ کی معیت جو آنحضرت ﷺ کو حاصل تھی اس میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نصرت کو اللہ تعالیٰ اپنی نصرت قرار دیتا ہے۔

1294 - ﴿خِفَافًا وَّ ثِقَالًا﴾ ہلکا ہونا اور بوجھل ہونا کئی طرح سے ہو سکتا ہے۔ اس لیے ان الفاظ کی کئی تاویلات کی گئی ہیں۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ خِفَافًا یا ہلکا ہونے میں ہر وہ امر شامل ہے جس کی وجہ سے نکلنا سہل ہو۔ جیسے قوت بدن، صحت جسمانی، جوانی کی عمر، فراخیٔ مال، شغل سے فراغت، سواری کا ہونا اور اس کے خلاف جو کچھ ہو وہ ثقال میں داخل ہے۔ جیسے ضعف جسمانی، کمزوری، بیماری، بڑھاپا، تنگیٔ مال، صورت معاش کا نہ ہونا وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ جب ضرورت آ پڑے تو جس حال میں بھی ہو نکل پڑو۔

ع 6 5 12 اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ (1295)

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ اللہ تجھے معاف کرے تو نے کیوں ان کو اجازت دی یہاں تک کہ جو سچے تھے وہ تیرے لیے الگ ہو جاتے اور تو جھوٹوں کو بھی جان لیتا۔ (1296)

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں وہ تجھ سے اجازت نہیں مانگتے کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد (نہ) کریں اور اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔

1295 - عَرَض۔ عَرض چوڑائی یا وسعت کو کہتے اور عَرَضٌ وہ ہے جسے ثبات نہ ہو اس لیے حدیث میں آتا ہے [اَلدُّنْيَا عَرَضٌ حَاضِرٌ] (السنن البیهقی الکبری، جلد3، صفحہ216، حدیث: 5598) پس عرض سے مراد تھوڑی دیر رہنے والا منافع یا مال دنیا ہے ﴿تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۗ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ﴾ [الأنفال: 67:8] ''تم دنیا کا مال چاہتے تھے اور اللہ (تمہارے لیے) آخرت کو چاہتا ہے۔'' ﴿يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى﴾ [الأعراف: 169:7] ''وہ اس ادنیٰ زندگی کا سامان لے لیتے ہیں۔'' (غ)

الشُّقَّةُ۔ وہ جانب جس کے پہنچنے میں مشقت اٹھانی پڑے اور شِقّ کے معنی مشقت ہیں ﴿اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ﴾ [النحل: 7:16] ''سوائے جانوں کو مشقت میں ڈالنے کے۔'' (غ)

یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو پیچھے رہ گئے یعنی منافقین۔ چنانچہ ایک طرف لَاتَّبَعُوْكَ صاف بتاتا ہے دوسری طرف ان کا جھوٹی قسمیں کھانا اور پھر اگلے رکوع کا مضمون سب اس پر گواہ ہیں کہ اس رکوع میں منافقوں کا ذکر ہے۔

1296 - ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ﴾ یہ کلمہ بعض وقت صرف محبت اور تعظیم کے لیے بولا جاتا ہے۔ (ر) ایسا ہی موقعہ یہاں ہے۔ جنگ تبوک کی مشکلات کو دیکھ کر منافقوں نے جو ہمیشہ جنگوں میں پیچھے رہ جاتے تھے عذر پیش کر کر کے نبی کریم ﷺ سے اجازت مانگی۔ آپ میں اس قدر حیا تھی کہ آپ نے ان کا پول کھولنا پسند نہ کیا اور ان کو اجازت دے دی۔ یہ اجازت دینا اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف نہ تھا۔ بلکہ محض ایک طبعی حیا کی وجہ سے اور درحقیقت ایک نہایت بلند مقام اخلاق تھا جس کو ظاہر کرنے کے لیے یہ فرمایا۔ گویا آپ میں صفت عفو اس قدر غالب ہے کہ اس پر ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تجھے بھی معاف کرے۔ یعنی جیسا معاملہ تو لوگوں سے کرتا ہے ایسا ہی اللہ تجھ سے کرے۔ اس میں صدور گناہ کا وہم بھی نہیں پایا جاتا۔ ہاں یہ فرمایا کہ اب موقعہ آ چکا تھا کہ یہ منافق الگ ہو جاتے۔ روح المعانی میں علی بن الجہیم کا شعر متوکل کی مدح میں نقل کیا ہے جس میں یہی لفظ آتے ہیں ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ﴾

اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾

وہی تجھ سے اجازت چاہتے ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان نہیں لاتے، اور ان کے دل شک میں پڑ گئے ہیں سو وہ اپنے شک میں متردّد ہیں۔

وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّ لٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَ قِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

اور اگر ان کا ارادہ نکلنے کا ہوتا تو اس کے لیے سامان مہیا کرتے لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا پسند نہ کیا، سو ان کو بوجھل کر دیا اور کہا گیا بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ (1297)

اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا [لَقَدْ عَجِبْتُ مِنْ يُوْسُفَ عَلَيْهِ السَّلَامِ وَكَرَمِهٖ وَصَبْرِهٖ وَاللّٰهُ تَعَالٰى يَغْفِرَ لَهٗ حِيْنَ سُئِلَ عَنِ الْبَقَرَاتِ الْعِجَافِ وَالسِّمَانِ] (روح المعانی، جلد 10، صفحہ 108) ''مجھے یوسف علیہ السلام پر اور آپ کے کرم اور صبر پر تعجب ہے اور اللہ ان کو بخشے جب ان سے دبلی اور موٹی گائیوں کے متعلق سوال کیا گیا۔'' یہاں ذکر ان کے کرم وصبر کا ہے اور ساتھ دعائے مغفرت ہے۔ مطلب یہی ہے کہ جس طرح اس نے مغفرت سے کام لیا اللہ اس سے مغفرت کرے۔

1297 - اَعَدُّوْا۔ عُدَّةٌ دونوں کا مادہ عَدَد ہے اور چونکہ بہتوں کو بھی گننے کی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے کثرت پر بھی اس کا استعمال ہوا ہے (قلت کے استعمال کے لیے [دیکھو نمبر: 224]) اور اَعْدَدْتُّ کے معنی ہیں ایک چیز کو ایسا بنایا کہ دوسرا اس کو شمار میں لائے اور حسب حاجت لے لے۔ ﴿اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة: 24:2] ''یہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔'' ﴿وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ﴾ [التوبة: 100:9] ''اور ان کے لیے باغ تیار کیے ہیں۔'' ﴿اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ [الكهف: 102:18] ''ہم نے دوزخ کو کافروں کے لیے تیار کیا ہے۔'' جو سب تیار کرنے کے معنی میں ہیں اور عُدَّةٌ وہ شے کثیر ہے جو گنی جائے مال ہو یا ہتھیار۔ (غ)

ثَبَّطَ۔ کے معنی ہیں روک دیا یا ایک چیز سے ہٹا دیا۔

مطلب یہ ہے کہ ان کا ارادہ کبھی جنگ کے لیے نکلنے کا ہوا ہی نہیں اور اس پر قرینہ یہ ہے کہ انہوں نے کوئی تیاری ہی نہیں کی ہاں اللہ تعالیٰ کو بھی ان کا نکلنا ناپسند ہی تھا کیونکہ ان سے بوجہ ان کی دلی بیماری کے بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا۔ ان کا نہ اُٹھنا اور ان کا رک رہنا ان کا اپنا فعل ہے۔ مگر اس کو منسوب اللہ تعالیٰ کی طرف کیا ہے۔ کیونکہ ان کے کسی پہلے فعل پر بطور سزا کے اللہ تعالیٰ نے ہی یہ نتیجہ مترتب کیا ہے۔ ان کے نکلنے سے کیا نقصان ہوتا، وہ اگلی آیت میں بیان کیا ہے۔

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّ لَاْ اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَ فِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾

اگر تم میں (مل کر) نکلتے تو تم میں سوائے فساد کے کچھ نہ بڑھاتے اور تمہارے اندر تمہارے لیے دکھ چاہتے ہوئے چغلیاں پھیلاتے پھرتے اور تم میں ان کے جاسوس بھی ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ (1298)

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَ قَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَ ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾

یقیناً انہوں نے پہلے بھی دکھ میں ڈالنا چاہا اور تیرے لیے تدبیریں کرتے رہے یہاں تک کہ حق آ گیا اور اللہ کا حکم غالب رہا اور وہ برا مانتے ہی رہے۔ (1299)

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَ لَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾

اور ان میں وہ بھی ہے جو کہتا ہے مجھے اجازت دیجیے اور مجھے دکھ میں نہ ڈالیے۔ دیکھو دکھ میں تو یہ پڑ ہی گئے اور دوزخ یقیناً کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ (1300)

1298 - ﴿اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ﴾ وَضَعَ کے معنی رکھنا اور جانور کے تیز چلنے پر بولا جاتا ہے۔ (غ) اَوْضَعَ اس کو تیز چلایا اور تیز چلنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ خِلَالٌ خَلَلٌ کی جمع ہے دو چیزوں کے درمیان خالی جگہ۔ (غ) اَوْضَعُوْا کا مفعول نَمَآئِم مقدر ہے یعنی چغلیاں یا [اَوْضَعُوْا بِالنَّمَآئِمِ] ترکیب ہے اور معنی ہیں [سَعَوْا وَسَطَكُمْ بِالنَّمَآئِمِ]۔

﴿سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ﴾ یعنی ان کی خاطر سننے والے یا اس غرض کے لیے بات سننے والے کہ ان کو پہنچائیں۔ جاسوس۔

چونکہ فی الواقع یہ لوگ مسلمانوں کی تباہی چاہتے تھے اس لیے اگر وہ نکلتے تو فساد پھیلانے کی ہی کوشش کرتے۔ پس ان کا نہ نکلنا بہتری کا موجب ہی تھا۔ گو ان کا یہ فعل مستحسن نہیں۔

1299 - ﴿قَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ﴾ [تَقْلِيْبُ الْاُمُوْرِ] یعنی امور کے ہیر پھیر کے معنی محاورہ میں تدبیر ہیں۔ (غ) کیونکہ تدبیر میں معاملات کے سب پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے۔ مراد ان کی منصوبہ بازیاں اور سازشیں ہیں جو نبی کریم ﷺ کے خلاف کرتے رہتے تھے۔

﴿اَمْرُ اللّٰهِ﴾ جو اللہ نے پہلے فرما دیا۔ اللہ کا حکم، وہی آخر کار غالب رہا۔

1300 - روایت ہے کہ بعض منافقوں نے یہ عذر بنا لیا کہ عیسائیوں کی عورتیں خوبصورت ہیں ہم ان کے ساتھ جنگ کرنے جائیں گے تو

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ يَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ فَرِحُوْنَ ۝۵۰

اگر تجھے بھلائی پہنچے انہیں برا لگتا ہے اور اگر تجھے تکلیف پہنچے کہتے ہیں ہم نے اپنا کام پہلے ہی سے ٹھیک کرلیا تھا اور وہ پھر جاتے ہیں اس حال میں کہ خوشیاں منا رہے ہوتے ہیں۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۵۱

کہہ دے، ہم کو ہرگز کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ رکھی ہے وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ پر ہی مومنوں کو بھروسا رکھنا چاہیے۔ (1301)

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَ نَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ۝۵۲

کہہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے ہی ایک کا انتظار کرتے ہو اور ہم تمہارے حق میں انتظار کرتے ہیں کہ اللہ تم پر کوئی عذاب (یا) اپنی طرف سے لائے یا ہمارے ہاتھوں سے۔ سو انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں۔ (1302)

ان کی وجہ سے فتنہ میں پڑیں گے۔ لیکن یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ آپ کے ساتھ نکلنے سے مال وعیال ہلاک ہو جائے گا۔ ہمیں اس تکلیف میں نہ ڈالیے۔ جواب میں فرمایا دکھوں میں تو اپنے افعال سے پڑ چکے ہیں یعنی اس دنیا میں بھی دکھوں میں مبتلا ہوں گے اور پھر جہنم آئندہ زندگی میں ہے۔

1301 - یعنی تم ہم کو مصیبت پہنچانے پر قادر نہیں مگر چونکہ بعض مصائب انسان کی ترقی کے لیے ضروری ہوتی ہیں اس لیے فرمایا کہ ایسی مصائب جو اللہ نے ہمارے لیے مقدر کر رکھی ہیں ان کو ہم خوشی سے اٹھانے کو تیار ہیں کیونکہ وہ ہماری بہتری کا موجب ہیں۔ ﴿هُوَ مَوْلٰىنَا﴾ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

1302 - ﴿اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ﴾ دو بھلائیوں میں سے ایک۔ منافق کبھی تو خیال کرتے تھے کہ مسلمان اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے مارے جائیں گے۔ کبھی نصرتوں کو دیکھ کر سمجھتے تھے کہ کامیاب ہو جائیں گے۔ ان دونوں باتوں کو مسلمانوں کے حق میں بھلائی فرمایا۔ اس لیے کہ اگر کفار کے ہاتھ سے مارے جائیں تو بہرحال مقصد زندگی تو حاصل کرلیا کہ حق کی خاطر اپنی

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾

کہہ دے خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا کیونکہ تم نافرمان قوم ہو۔ (1303)

وَ مَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوْلِهٖ وَ لَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى وَ لَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور کوئی چیز ان کے حق میں مانع نہیں ہوئی کہ ان کے خرچ ان سے قبول کے جائیں سوائے اس کے کہ وہ اللہ کا اور اس کے رسول کا انکار کرتے ہیں اور نماز کو نہیں آتے مگر اس حال میں کہ وہ کاہل ہوں اور خرچ نہیں کرتے مگر اس حال میں کہ وہ ناخوش ہوں۔ (1304)

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ لَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾

سو ان کے مال تجھے تعجب میں نہ ڈالیں اور نہ ان کی اولاد ہی۔ اللہ یہی چاہتا ہے کہ ان کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں ان کو عذاب دے اور ان کی جانیں نکلیں جب وہ کافر ہوں۔ (1305)

جانیں دے دیں۔ نتیجہ تو پھر بھی اچھا ہوا۔ اور یا نصرت الٰہی کے ساتھ حق پھیل گیا اور کامیاب ہو گئے تو یہ بھی بھلائی ہے۔ دنیا کے مال کی خاطر، دنیا کی عزت کی خاطر، دنیا کی حکومت کی خاطر وہ جنگ نہ کرتے تھے جو ان کا مارا جانا حصول مقصد زندگی کے منافی ہوتا۔ لیکن بالمقابل منافقوں کے لیے عذاب ہی تھا۔ کیونکہ اگر مسلمان مارے بھی جائیں تو بھی منافقوں کو اس سے فائدہ نہ تھا بلکہ ضرور تھا کہ وہ اپنے اعمال بد کی سزا پاتے۔ یہ ﴿عَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ﴾ ہے اور اگر مسلمان کامیاب ہوں تو پھر جو کچھ منصوبے مسلمانوں کی تباہی کے منافقوں نے کیے ضرور تھا کہ ان کی پاداش میں سزا پاتے۔ اس کی طرف بِاَيْدِيْنَا میں اشارہ ہے۔

1303 - منافق کھلی مخالفت تو کر نہ سکتے تھے۔ اس لیے کچھ نہ کچھ مال بھی ان کو خرچ کرنا پڑتا تھا اور بعض وقت جنگوں میں بھی نکلنا پڑتا تھا۔ مگر چونکہ اخلاص نہ تھا، اللہ کے ہاں ان اعمال کی کوئی قدر نہ تھی۔

1304 - نہ اللہ سے کوئی تعلق، کیونکہ نماز بھی مجبوری کی پڑھتے ہیں۔ نہ مسلمانوں سے حقیقی تعلق کیونکہ خرچ اخلاص سے نہیں کرتے بلکہ محض بحالت مجبوری کہ اپنے آپ کو ظاہر مسلمان کرتے ہیں۔ یہی بات ان کے نفقات کے نہ قبول ہونے کا موجب ہوگئی۔ کیونکہ قبول اخلاص ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ **نماز میں سستی** یعنی ایسی حالت کہ انسان بوجھ سمجھ کر نماز پڑھے علامت نفاق ہے۔

1305 - **اللہ تعالیٰ کا مال اور اولاد کے ذریعہ ان منافقوں کو عذاب دینا یوں تھا** کہ ان کو مال جنگوں وغیرہ میں خرچ کرنا پڑتا تھا اور زکوٰۃ

وَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَ لٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تمہی میں سے ہیں اور وہ تم میں سے نہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو ڈر رہے ہیں۔ (1306)

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَ هُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾

اگر کوئی پناہ کی جگہ یا غاریں یا گھسنے کی جگہ پائیں تو اس کی طرف پھر جائیں اور وہ بے تحاشہ بھاگ رہے ہوں۔ (1307)

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَ اِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو زکوٰۃ (کے بانٹنے) میں تجھے طعنہ دیتے ہیں سو اگر ان میں سے ان کو دے دیا جائے تو راضی ہو جاتے ہیں اور اگر ان میں سے ان کو نہ دیا جائے تو ناخوش ہو جاتے ہیں۔ (1308)

بھی دینی پڑتی تھی۔ لیکن چونکہ دل سے یہ نہ چاہتے تھے اس لیے یہ خرچ ان کے لیے عذاب کا موجب ہو رہا تھا اور ان کی اولاد کی وجہ سے یوں عذاب تھا کہ وہ لوگ دین اسلام کے خادم تھے اور اپنی جانیں خدا کی راہ میں دیتے تھے۔ جس اسلام کو وہ خود نیست و نابود کرنے کے منصوبے کرتے تھے اسی کی خاطر ان کی اولاد اپنی جانیں قربان کر رہی تھی۔ عبداللہ بن اُبی کا لڑکا عبداللہ مخلص مومن تھا۔

1306 - يَفْرَقُوْنَ۔ فَرَّقَ کے معنی الگ ہونا ہیں۔ اسی سے امن سے حالت مفارقت یعنی خوف بھی فَرَّقَ کے معنی آتے ہیں۔ راغب کہتے ہیں فَرَّقَ خوف کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ دل کی حالت خوف سے پراگندگی کی ہوتی ہے یعنی ان کا قسمیں کھانا کہ ہم مسلمان ہیں محض خوف کی وجہ سے ہے۔ ورنہ دلوں میں کفر بھرا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے مقابلہ کی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے اظہار مخالفت نہیں کرتے۔

1307 - مَلْجَاً۔ لَجَأَ کے معنی کسی چیز کی پناہ لینا یا اس سے ٹیک لگانا۔ (ل) اسی سے التجا ہے۔

مُدَّخَلًا۔ ادَّخَلَ کے معنی ہیں [اِجْتَهَدَ فِيْ دُخُوْلِهٖ] داخل ہونے میں زور لگایا۔ اسی سے مُدَّخَل ہے۔ (غ)

يَجْمَحُوْنَ۔ جَمَحَ کا اصل استعمال گھوڑے پر ہے جب وہ چلنے میں نشاط کی وجہ سے سوار پر غالب آ جائے یعنی اس کے قابو سے نکل جائے۔ (غ)

1308 - يَلْمِزُ۔ لَمَزَ کے معنی پیٹھ کے پیچھے بات کا کہنا اور معائب کے پیچھے لگنا ﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ [الحجرات: 11:49] ''اور اپنے

وَ لَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۙ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝۵۹ ع 7 17 13

اور (کیا اچھا ہوتا) اگر وہ اس پر راضی ہو جاتے جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا تھا اور کہتے اللہ ہمارے لیے بس ہے اللہ اپنے فضل سے اور اس کا رسول (اور بھی) ہم کو دے گا۔ ہم تو اللہ کی طرف ہی رغبت رکھنے والے ہیں۔ (1309)

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۶۰

زکوٰۃ صرف ناداروں کے لیے ہے اور مسکینوں اور اس کے کارکنوں (کے لیے) اور جن کے دل مائل کرنے ہیں اور غلاموں کے (آزاد کرنے) اور قرض داروں (کے لیے) اور اللہ کی راہ میں اور مسافر (کے لیے) یہ اللہ کی طرف سے ضروری ٹھہرایا گیا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (1310)

لوگوں کو عیب نہ لگاؤ۔'' اور لُمَزَةٍ وہ ہے جو کثرت سے دوسروں کی عیب شماری کرے ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝۱﴾ [الھمزۃ: 1:104] ''تباہی ہے ہر عیب لگانے والے، طعن کرنے والے کے لیے۔''

يَسْخَطُوْنَ۔ سَخَطَ اور سُخْطَ غضب شدید کو کہتے ہیں جس کا اقتضاء عقوبت ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف انزال عقوبت ہے ﴿كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ [آل عمران: 162:3] ''وہ اس کی طرح ہو سکتا ہے جو اللہ کی ناراضگی کما لائے۔''

1309 - مطلب یہ ہے کہ اسلام کی اصل غرض کوئی مال لوگوں کو دینا تو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنا اور اس کی رضا کی طرف قدم بڑھانا ہے۔ پس ان کو چاہیے تھا کہ اصل غرض کو مقدم رکھتے۔ ہاں اسلام نے دنیوی زندگی کے لیے بھی اعلیٰ درجہ کے اصول قائم کر دیئے ہیں۔ منجملہ ان کے غربا کی خبر گیری ہے، سو وہ بھی ہوتی رہتی ہے۔ مگر جس شخص نے مال کو ہی زندگی کا مقصد قرار دے لیا وہ اصل راہ کو چھوڑ کر دور نکل گیا۔

1310 - صَدَقٰتُ۔ صَدَقَةٌ وہ ہے جو انسان اپنے مال سے قرب حاصل کرنے کے لیے خرچ کرے اور اصل میں صَدَقَةٌ اسے کہا جاتا ہے جو بطور تطوع دیا جائے۔ یعنی اپنی خوشی سے یا نفل کے طور پر اور جس کا دینا واجب ہے اسے زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ لیکن بعض وقت بلحاظ اصل معنی کے زکوٰۃ کو بھی صَدَقَةٌ کہا جاتا ہے۔ جب اس کا دینے والا صدق کا طالب ہو جیسے ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا﴾ [103] ''ان کے مالوں سے زکوٰۃ لے لے تاکہ اس سے تو انہیں پاک اور صاف کرے۔''

وَ مِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ١ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ

اور ان میں سے وہ لوگ جو نبی کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ کان (کا کچا) ہے۔ کہہ دے، تمہاری بھلائی کے لیے

یہاں بھی زکوٰۃ ہی مراد ہے۔ (غ) کیونکہ جو نفل صدقات ہوں وہ ہر انسان جس طرح چاہے دے سکتا ہے معین تقسیم اسی کی ہوسکتی ہے جو بیت المال میں داخل ہو اور یہ زکوٰۃ ہی ہے۔

خرچ زکوٰۃ کی مدات:

منافقوں کی ایذا رسانی کا ذکر کرتے ہوئے پچھلے رکوع کے آخر پر فرمایا تھا کہ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو مال زکوٰۃ کی تقسیم میں آنحضرت ﷺ پر طعن کرتے ہیں کہ فلاں کو دیا فلاں کو نہ دیا۔ اس لیے یہاں بتایا ہے کہ زکوٰۃ (صدقات سے یہاں خاص مال زکوٰۃ ہی مراد ہے۔ کیونکہ یہی صدقات بیت المال میں جمع ہوتے تھے اور انہی کی تقسیم پر طعن ہوسکتا تھا) کی تقسیم کس طرح ہو۔ اس خرچ کی یہاں آٹھ مدات بیان کی ہیں؛

1. پہلے فقراء یعنی نادار لوگ۔
2. دوسرے **مسکین جو گو بالکل نادار تو نہ ہوں مگر بغیر امداد کے اپنی روزی کمانے کے قابل نہ ہوسکیں۔** مثلاً اہل حرفہ کے لیے خاص ہتھیار، طالبعلموں کے لیے ذرائع حصول علم کا مہیا کرنا وغیرہ۔ **امام شافعی نے فقیر اور مسکین میں اسی کے قریب قریب فرق بیان کیا ہے۔** وہ کہتے ہیں فقیر وہ ہے جس کے پاس نہ مال ہو نہ اس کے ہاتھ میں کوئی کسب ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس مال یا کسب تو ہو مگر اس کی ضروریات کے لیے مکتفی نہ ہو۔ اس پر انہوں نے قرآن کریم کی آیت ﴿ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ ﴾ [الکھف: 79:18] ''جو کشتی تھی وہ تو مسکین لوگوں کی تھی۔'' کو پیش کیا ہے کیونکہ جن کے پاس کشتی تھی وہ نادار نہ تھے۔
3. تیسرے **وہ لوگ جو صدقات کے انتظام پر متعین ہوں۔** جیسے **مال زکوٰۃ جمع کرنے والے**، اس کے تقسیم کرنے والے۔
4. چوتھے **مؤلفۃ القلوب** یعنی ایسے لوگ جن کے دلوں سے تنفر دور کرنا مقصود ہو اور ان کے دلوں کو حق کی طرف مائل کرنا ہو۔ روح المعانی میں ہے کہ اس میں تین گروہ آتے ہیں۔

(1) اول ایسے لوگ جو اسلام نہیں لائے اور ان کو اسلام کے قریب لانے کی ضرورت ہے، ان کو مال دینے کی غرض یہ نہیں کہ پیسوں سے ان کا ایمان خریدا جائے۔ ایسے ایمان کو اسلام ایک لحہ کے لیے نہیں چاہتا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ حصول تعلیم اسلام کے لیے یا اسلام سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ان کو مدد دینے کی ضرورت ہے تو دی جائے۔

(2) دوم وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں مگر ان کا ایمان ابھی کمزور ہے یعنی نومسلموں کی امداد اور ان کو تعلیم اسلام میں مضبوط کرنا۔

يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ

ہی کان (دھرتا) ہے اللہ پر ایمان لاتا ہے اور مومنوں کی بات کو مانتا ہے اور ان لوگوں کے لیے رحمت ہے جو تم میں سے ایمان لائے اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں

---

(۳) سوم وہ لوگ جن کے شر سے اسلام کو بچانا مقصود ہو۔

۵ پانچویں **فی الرقاب** جس کے معنی گردنوں کو آزاد کرنا ہیں اور یہ تین طرح پر ہوسکتا تھا۔

(۱) اول یہ کہ حکومت کی طرف سے ان لوگوں کی امداد کی جائے جو غلامی کی حالت سے نکلنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اسلام نے غلام کو یہ حق دیا تھا کہ وہ اپنے مالک سے مکاتبت کرلے لیکن اس کی آزادی مشروط ہو۔ اس بات پر کہ ایک خاص رقم مالک کو جمع کر کے دے تو اس میں امداد دینا یا اس رقم کا مہیا کرنا حکومت کا فرض ٹھہرایا کہ وہ بیت المال سے ان لوگوں کی امداد کرے۔

(۲) دوم یہ کہ حکومت خود مالکوں سے غلام خرید کر ان کو آزاد کرے۔

(۳) سوم یہ کہ اس سے اسیران جنگ کا فدیہ ادا کیا جائے۔ وہ اسیران جنگ ظاہر ہے کہ دشمن قوم میں سے اور پھر غیر مسلم ہوں گے۔ یہ تعلیم اسلامی کی وسعت ہے۔

۶ چھٹے **قرضداروں کا قرضہ ادا کرنے کے لیے** یا جن پر جرمانہ ہوگیا ہو، ان کا جرمانہ ادا کرنے کے لیے۔

۷ ساتویں **فی سبیل اللہ** یعنی جہاد کے لیے۔ خواہ وہ جہاد قلمی ہو یا سیفی۔ کفار کے حملوں سے اپنے مذہب کو محفوظ کرنے کے لیے اور اصول حقہ کو کافروں میں پھیلانے کے لیے۔ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کو مال زکوٰۃ لینا جائز ہے گو وہ غنی ہو کیونکہ اس کی غرض اس مال کو دشمنوں کے مقابلہ میں خرچ کرنا ہے۔

۸ آٹھویں **مسافر کے لیے۔** کیونکہ اپنے گھر سے باہر وہ بھی مفلس کے حکم میں ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ مراد اس سے ایسا مسافر ہے جو محتاج امداد ہو۔

فریضہ زکوٰۃ سے مسلمانوں کی غفلت:

فریضۂ زکوٰۃ ایک ایسا فریضہ تھا جو مسلمانوں کی ساری قومی ضروریات کا متکفل ہوسکتا تھا۔ مگر آج اس کی یہ حالت ہے کہ اول تو مسلمان مال زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور جو کرتے ہیں تو اس کے ایک جگہ جمع ہو کر ضروریات قومی پر خرچ ہونے کا کوئی انتظام نہیں۔ بلکہ عموماً اپنے اپنے طور پر اور اکثر اوقات غیر مستحق لوگوں میں وہ مال تقسیم ہو کر اصل غرض اس فریضہ کی ضائع ہو جاتی ہے۔ فریضۂ زکوٰۃ ایک ایسا اعلیٰ درجہ کا انتظام تقسیم دولت ہے کہ جس کے نہ ہونے کی وجہ سے یورپ کو طرح طرح کے مصائب کا سامنا درپیش ہے، جن مصائب کا علاج سوائے زکوٰۃ کے اور کچھ نہیں۔ سوشلزم اور بولشوزم محض دھوکہ دینے والے خیالات ہیں

لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝٦١ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔(1311)

جو عملی رنگ میں کبھی قائم نہیں ہوسکتے۔ تقسیم دولت کے مسئلہ میں یورپ کو جو سب سے بڑی مشکل پیش آئی ہے وہ یہ ہے کہ دولت کا رجحان کہ چند ہاتھوں میں زیادہ مقدار میں جمع ہوتی چلی جائے اور بیشتر حصہ نسل انسانی میں غربت یا مسکنت کی حالت میں رہے یا ایسی حالت میں کہ بمشکل وہ اپنی گزر کرنے کے قابل ہوں۔ اس کا علاج اسلام نے طرح طرح کے رنگوں میں کیا ہے۔ انہی علاجوں میں سے ایک علاج زکوٰۃ ہے کہ اغنیا کی دولت میں سے ہر سال چالیسواں حصہ نکل کر غربا میں تقسیم ہوتا رہے۔ دوسرے دو علاج ایک تقسیم وراثت ہے اور دوسرا ممانعت سود۔

بیت المال کی ضرورت:

مسلمانوں کے کل قومی کام آج صرف ایک فریضۂ زکوٰۃ کے قیام پر ہوسکتے ہیں بشرطیکہ اس کے جمع کرنے کا کوئی انتظام ہو۔ قرآن کریم نے تو زکوٰۃ کو ایک جگہ جمع کرنے کی ضرورت یہاں تک مقدم کی ہے کہ اخراجات زکوٰۃ میں ایک مد خصوصیت سے کارکنان زکوٰۃ کی قائم کردی ہے جس پر خرچ کرنا ضروری ٹھہرایا ہے۔ گویا قرآن کریم کوئی حالت زکوٰۃ ایسی فرض نہیں کرتا کہ ہر شخص اپنی زکوٰۃ آپ ادا کرے بلکہ اس کا قومی بیت المال میں جمع ہونا اور پھر وہاں سے تقسیم ہونا ضروری ہے۔ کاش مسلمان اس طرف توجہ کریں۔

اشاعت اسلام اور تعلیم پر زکوٰۃ کا خرچ کرنا:

پھر مسلمانوں کی سب سے بڑی دو قومی ضرورتیں اس وقت ہیں۔ ایک اشاعت اسلام، دوسرے تعلیم ہر قسم کی۔ سو یہ دونوں کام زکوٰۃ کے مصارف میں داخل ہیں۔ اور آج اگر زکوٰۃ کا روپیہ ایک جگہ جمع ہو تو مسلمانوں کے یہ دونوں کام عمدہ طور پر سرانجام پاسکتے ہیں۔ اشاعت اسلام پر تو آج زکوٰۃ کا روپیہ بالکل صرف نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا کوئی قومی انتظام ہی مسلمانوں نے نہیں رکھا۔ حالانکہ فی سبیل اللہ کا لفظ خصوصیت سے اشاعت اسلام کے لیے موجود ہے۔ اور تعلیم پر شاید علماء کا فتویٰ نہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر اغنیا سے تعلیم کی فیس لی جائے اور تعلیم کا خرچ کل زکوٰۃ سے ادا کیا جائے تو اس طرح زکوٰۃ کا مصرف صرف غیر اغنیا کے لیے رہ گیا اس میں کون سا محذور لازم آتا ہے۔ اصول تقسیم زکوٰۃ کہ اس کا خرچ عموماً غیر اغنیا کے لیے ہو قائم رہ گیا اور ظاہر ہے کہ بیشتر حصہ مسلمان آبادی کا بلحاظ ضرورت تعلیم مساکین میں داخل ہے۔

یتامیٰ اور زکوٰۃ:

بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ یتامیٰ پر زکوٰۃ کا روپیہ خرچ نہیں ہوسکتا۔ یہ انہوں نے اس سے قیاس کیا ہے کہ یتامیٰ کی مد مصارفِ زکوٰۃ میں نظر نہیں آتی۔ حالانکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یتامیٰ غنی بھی ہوتے ہیں اور فقیر بھی۔ اس لیے یتامیٰ کی مد قائم کرنا درست نہ تھا۔ ہاں جو یتیم فقرا یا مساکین یا اور کسی مد میں آتے ہوں وہ اس مد کی ذیل میں زکوٰۃ کے مستحق ہیں۔

1311 - اُذُنٌ کے اصل معنی تو کان ہی ہیں مگر بطور استعارہ اس کا استعمال اس شخص پر بھی ہوتا ہے جو بات کو سن کر اسے فوراً قبول کرلے۔ (غ)

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾

تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تا کہ تم کو خوش رکھیں اور اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق دار ہیں کہ اس کو راضی کریں اگر وہ مومن ہیں۔ (1312)

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۳﴾

کیا ان کو معلوم نہیں ہوا کہ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے اسی میں وہ رہے گا یہ بڑی رسوائی ہے۔ (1313)

منافقوں کی مراد آنحضرت ﷺ کو اُذُنٌ کہنے سے یہی تھی کہ جب ہم آپ کے سامنے جا کر قسم کھا لیتے ہیں تو ہماری بات کا اعتبار کر لیتے ہیں۔ اس لیے آپ کی غیبت میں ہم جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں کریں۔ جب سامنے جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہمارا منشا یہ تھا تو آپ اس بات کو مان لیں گے۔ درحقیقت یہ امر نبی کریم ﷺ کے خلق عظیم میں سے تھا کہ آپ ان لوگوں کی طرح نہ تھے کہ کوئی بات کرے تو فوراً کہہ دیتے ہیں کہ تو جھوٹ کہتا ہے۔ **حسن ظن اور حیا آپ کی طبیعت میں غالب امور تھے۔** چنانچہ اسی کے مطابق ان کی اس بات کا جواب دیا ہے کہ اگر آپ بات کو سن کر مان لیتے ہیں تو یہ تمہاری ہی بھلائی کے لیے ہے۔ ایسا خلق دیکھ کر تو چاہیے تھا کہ تم آپ پر ایمان لاتے نہ یہ کہ اور ایذا دیتے اور آپ کا مان لینا محض بلحاظ رحمت کے ہے کیونکہ وہ مومنوں کے لیے رحمت ہے یعنی محض تم پر شفقت جبلی کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ حق و باطل میں تمیز ہی نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ بعض کان کے کچے لوگ ہوتے ہیں کہ جو بات سنی اس کو لے دوڑے۔ تحقیق اور تمیز کے متعلق دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ﴿اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾ [الحجرات: 6:49] اگر ایک فاسق کوئی خبر تمہارے پاس لائے تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ تحقیق کرنا اور امر ہے اور دوسرے کو جھوٹا کہہ دینا اور امر۔

1312 - يُرْضُوْهُ پیچھے اللہ اور رسول دونوں کا ذکر ہے مگر یہاں ضمیر واحد ہے اس لیے کہ اصل رضا اللہ تعالیٰ کی ہی مطلوب ہے۔ بشر کی ناراضگی بلاوجہ بھی ہو سکتی ہے۔ گو وہ رسول ہی ہو۔ کیونکہ اسے غلطی لگ سکتی ہے اور دوسرے رسول کی اطاعت فی الحقیقت اللہ کی اطاعت میں داخل ہے۔

1313 - يُّحَادِدِ۔ حَدٌّ سے ہے جس کے ایک معنی جہت کے ہیں۔ پس مُحَادَّةٌ ایک دوسرے سے عداوت اور مخالفت کی جانب میں ہو جانا ہے۔ اسی طرح يُشَاقِقِ کا لفظ ہے ایک شق میں ہو جانا۔ (ل) اسی طرح مُعَادَاةٌ ہے کہ عُدْوَةٌ بھی ایک کنارہ کو کہتے ہیں۔ راغب نے اس معنی کی وجہ ممانعت یا استعمال حدید دی ہے اور ممانعت کے معنی حد میں شامل ہیں۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾

منافق ڈرتے ہیں کہ ان پر کوئی سورۃ (نہ) اتاری جائے جو ان کو ان باتوں کی خبر دے دے جو ان کے دلوں میں ہیں۔ کہہ دے ہنسی کیے جاؤ اللہ اس کو کھولنے والا ہے جس کا تم کو ڈر ہے۔ (1314)

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾

اور اگر تو ان سے سوال کرے تو کہیں گے ہم تو یوں ہی باتیں اور دل لگی کرتے تھے۔ کہہ کیا اللہ اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول کے ساتھ تم ہنسی کرتے تھے؟ (1315)

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۶۶﴾ ع 8 7 14

بہانے نہ بناؤ تم نے یقیناً اپنے ایمان کے بعد کفر کیا۔ اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف کریں گے تو ایک گروہ کو عذاب دیں گے۔ اس لیے کہ وہ مجرم تھے۔ (1316)

1314 - ﴿تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ﴾ میں ضمیر مومنوں کی طرف بھی ہوسکتی ہے اور منافق بھی مراد ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ جو کچھ نازل ہوتا تھا وہ ان پر بھی نازل ہوتا تھا۔ اسی طرح تُنَبِّئُهُمْ میں ضمیر دونوں طرف ہوسکتی ہے۔ منافقوں کا یہ حذر بھی بطور استہزاء تھا جیسا کہ ﴿قُلِ اسْتَهْزِءُوْا﴾ سے ظاہر ہے۔

1315 - تَخُوْضُ۔ خَوْضُ اصل میں ایسی چیز میں داخل ہونے کو کہتے ہیں جیسے پانی یا کیچڑ۔ اس لیے کسی ایسے امر میں داخل ہونے پر بولا جاتا ہے جو انسان کو ملوث کرے۔ اکثر استعمال اس کا قرآن شریف میں ذم کے موقعہ پر ہی ہوا ہے۔ یہاں بتایا ہے کہ بعض منافق یہ بھی عذر کر دیتے تھے۔ آج بعض مسلمان امور دینی میں ہنسی کرتے ہیں اور ان کا ذکر ایک مشغلہ کے طور پر کرتے ہیں۔ وہ غور کریں کہ جو کچھ منافقوں کے متعلق قرآن شریف نے فرمایا تھا اس کے مصداق وہ ہو رہے ہیں۔

1316 - تَعْتَذِرُوْا۔ عُذْرٌ اس چیز کا قصد کرنا ہے جس سے گناہ مٹ جائے اور اِعْتَذَرَ کے معنی عذر پیش کیا اور عَذَرَ کے معنی اس کا عذر قبول کیا۔ اور اَعْذَرَ کے معنی ایسی بات پیش کی جس سے معذور ہو گیا اور راغب نے ایک قول نقل کیا ہے کہ عُذْرٌ کا لفظ عَذِرَةٌ سے ماخوذ ہے جو نجس شے کو کہا جاتا ہے۔ اور [عَذَرْتُ فُلَانًا] کے معنی ہیں اس کے گناہ کی نجاست کو عفو سے دور کیا۔ (غ)

وقف لازم

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۶۷﴾

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک سے ہی ہیں۔ وہ برے کام کرنے کو کہتے ہیں اور اچھے کاموں سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں۔ انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا، سو اللہ نے ان کو چھوڑ دیا۔ منافق ہی نافرمان ہیں۔ (1317)

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۶۸﴾

اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے دوزخ کی آگ کا وعدہ کیا ہے اسی میں رہیں گے وہ ان کو کافی ہے۔ اور اللہ نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے۔

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ

(تم منافق بھی) ان کی طرح ہو جو تم سے پہلے ہو چکے،

منافقوں کی آخری علیحدگی:

یہ ایک پیشگوئی تھی جو پوری ہوئی۔ منافقوں کا اکثر حصہ اسلام میں شامل ہو گیا، کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اس حالت نفاق کو ترک نہ کیا۔ ان کو بالآخر مسلمانوں سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس طرح پر کہ نبی کریم ﷺ نے خطبہ میں ان کے نام لے کر ظاہر کر دیا اور ان کو مسجد سے نکال دیا گیا اور ان سے زکوٰۃ نہ لی جاتی تھی یہی وہ عذاب تھا جو ان کو دیا گیا۔

1317 - ﴿بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ﴾ لفظی معنی ہیں بعض ان کے بعض میں سے ہیں۔ مگر مراد ان کا تشابہ ہے جس طرح ایک ہی چیز کے مختلف اجزا میں تشابہ ہوتا ہے۔ گویا وہ سب ایک ہی ہیں کیا مرد اور کیا عورتیں۔

﴿يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ﴾ قَبْض کے معنی ہیں کسی چیز کا پورے کَف سے لینا اور کسی شے پر [قَبْضُ الْيَدِ] سے مراد اس کا جمع رکھنا ہے اس کے لے لینے کے بعد اور ﴿يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ﴾ کے معنی ہیں خرچ کرنے سے رکتے ہیں۔ (غ)

﴿نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ﴾ میں بتا دیا کہ جس طرح کا فعل انسان کرتا ہے اسی طرح کی سزا اللہ کی طرف سے ملتی ہے یہاں نَسِیَ بمعنی ترک ہے [دیکھو نمبر: 67]۔

قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۹﴾

وہ تم سے طاقت میں زیادہ اور مالوں اور اولاد میں بڑھ کر تھے۔ سو انہوں نے اپنے حصے سے تھوڑا فائدہ اٹھالیا۔ پس تم بھی اپنے حصے سے تھوڑا سا فائدہ اٹھا رہے ہو جیسے ان لوگوں نے جو تم سے پہلے تھے اپنے حصے سے تھوڑا سا فائدہ اٹھایا اور تم بیہودہ باتوں میں لگے رہے[1318] جیسے وہ لگے رہے ان کے عمل دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور یہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۬ۙ وَ قَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَ اَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۷۰﴾

کیا ان کے پاس ان کی خبر نہیں آئی، جو ان سے پہلے تھے، نوح کی قوم اور عاد کی اور ثمود کی اور ابراہیم کی قوم کی اور مدین کے رہنے والوں کی اور تباہ شدہ بستیوں کی۔ ان کے رسول ان کے پاس دلائل لے کر آئے سو اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔[1319]

1318 - ﴿كَالَّذِيْ خَاضُوْا﴾ کی ترکیب دو طرح ہو سکتی ہے [كَالْخَوْضِ الَّذِيْ خَاضُوْهُ] یا اَلَّذِيْ کی اصل اَلَّذِيْنَ ہے اور نون تخفیف کے لیے گرا دیا گیا ہے اور مراد ہے: [كَالَّذِيْنَ خَاضُوْا]۔

1319 - اَلْمُؤْتَفِكٰتِ۔ مُؤْتَفِكَة کی جمع ہے اور اِئْتِفَاك کے معنی (جو اِفْك سے ہے) انقلاب ہیں اور مراد اس سے ہے سب لوگ جو ہلاک ہوئے اور نضر بن انس نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا اے بیٹے! بصرہ میں نہ اترنا [فَاِنَّهَا اِحْدَى الْمُؤْتَفِكَاتِ] اور بعض نے اسے صرف لوط کی بستیوں سے خاص کیا ہے۔ (ل) اور مفردات میں ہے کہ مُؤْتَفِكَةٌ وہ ہوائیں ہیں جو اپنے چلنے سے پھر جائیں۔

وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں وہ اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان پر اللہ رحم کرے گا۔ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

وقف لازم

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾ ع 9 6 15

اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں انہی میں رہیں گے اور ہمیشگی کے باغوں میں پاکیزہ رہنے کی جگہ اور اللہ کی رضا سب سے بڑھ کر (نعمت) ہے یہی بڑی بھاری کامیابی ہے۔ (1320)

1320- عَدْنٍ - [عَدَنَ بِمَكَانٍ] کے معنی ہیں اِسْتَقَرَّ یعنی مکان میں استقرار پکڑا۔ پس ﴿جَنّٰتِ عَدْنٍ﴾ وہ باغ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے یعنی ان سے کبھی نکالے نہ جائیں گے۔ اسی سے مَعْدِن ہے۔ (غ)

﴿رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ اللہ کی رضا کو یہاں جنت کی سب سے بڑی نعمت فرمایا ہے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث جو بخاری اور مسلم میں ہے اسی کی مؤید ہے۔ یہ ایک فیصلہ کن دلیل ہے کہ مسلمانوں کا بہشت کیسی چیز ہے جس کی سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کے رضا کا حصول ہے۔ پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ اللہ کی رضا مومن کو اس دنیا میں بھی مل جاتی ہے اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق تو نص صریح ہے۔ پس مومن کی جنت اسی دنیا سے شروع ہوتی ہے اور وہ جنت وہی چیز ہے جس میں مومن اور غیر مومن کا اشتراک نہیں۔ دنیا کی لذات فانی میں تو نہ صرف اشتراک موجود ہے بلکہ بعض وقت کفار اس سے زیادہ حظ اٹھا لیتے ہیں۔ مومنوں کا ذکر ان دو آیات میں کفار کے مقابلہ کے لیے کیا۔ جن کا ذکر منافقین کی تنبیہ کے لیے آ گیا تھا کہ تمہارا انجام بھی اسی طرح برا ہوگا جس طرح تم سے پہلے کفار کا انجام برا ہوا۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الۡكُفَّارَ وَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَ اغۡلُظۡ عَلَیۡهِمۡ ؕ وَ مَاۡوٰىهُمۡ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۷۳﴾

اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان کے مقابلہ میں شدت اختیار کر اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔ (1321)

1321 - جَاهِدِ۔ جُهۡد سے ہے جس کے معنی زور لگانا، کوشش کرنا ہیں اور جہاد اور مجاہدۃ دشمن کی مدافعت میں اپنی طاقت کا خرچ کرنا ہے۔ راغب کہتے ہیں جہاد تین طرح پر ہے۔ دشمن ظاہری سے مجاہدہ اور شیطان سے مجاہدہ اور اپنے نفس سے مجاہدہ اور ﴿جَاهِدُوۡا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ [الحج:22: 78] ''اللہ کی راہ میں کوشش کرو جو اس کی (راہ میں) کوشش کا حق ہے۔'' اور ﴿جَاهِدُوۡا بِاَمۡوَالِكُمۡ وَ اَنۡفُسِكُمۡ﴾ [41] ''اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو۔'' وغیرہ میں تینوں قسم کا جہاد شامل ہے اور پھر نبی ﷺ کی حدیث نقل کی ہے [جَاهِدُوا أَهْوَاءَكُمْ كَمَا تُجَاهِدُونَ أَعْدَاءَكُمْ] (تفسیر المنار، جلد، 10، صفحہ 269) اپنی خواہشات سے اسی طرح جہاد کرو جس طرح اپنے دشمنوں سے جہاد کرتے ہو اور پھر کہتے ہیں کہ مجاہدہ کبھی ہاتھ سے ہوتا ہے اور کبھی زبان سے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا [جَاهِدُوا الْكُفَّارَ بِأَيْدِيكُمْ وَأَلْسِنَتِكُمْ] (تفسیر المنار، جلد، 10، صفحہ 269) کافروں کے ساتھ جہاد کرو اپنے ہاتھوں سے اور اپنی زبانوں سے۔ پس جہاد لسانی بھی ہوسکتا ہے اور سیفی بھی۔

﴿اغۡلُظۡ عَلَیۡهِمۡ﴾ غِلَظ اصل میں رقت کی ضد ہے اور اس کا استعمال قوت اور مضبوطی پر بھی ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں آتا ہے ﴿مِّیۡثَاقًا غَلِیۡظًا﴾ [النسآء: 21:4] جس سے مراد مضبوط یا مؤکد عہد ہے۔ ایسا ہی ﴿فَاٰزَرَهٗ فَاسۡتَغۡلَظَ﴾ [الفتح: 29:48] ''سو وہ موٹی ہوئی۔'' مراد مضبوط ہونا، یا موٹا ہونا ہے اور غَلَظ اس زمین کو کہتے ہیں جو نرم نہ ہو بلکہ سخت ہو جس میں کوئی چیز آسانی سے داخل نہ ہوسکے۔ (ل) ﴿وَ اغۡلُظۡ عَلَیۡهِمۡ﴾ کے کیا معنی ہیں؟ دوسری جگہ آتا ہے ﴿وَ لۡیَجِدُوۡا فِیۡكُمۡ غِلۡظَةً﴾ [التوبۃ: 123:9] چاہیے کہ کافر تم میں شدت پائیں۔ پس یہاں بھی معنی وہی لیے جائیں گے یعنی ان کے مقابلہ میں شدت اختیار کرو۔

منافقوں کے ساتھ ایک مدت تک نبی کریم ﷺ نرمی برتتے رہے، ان کی شرارتوں پر چشم پوشی سے کام لیتے رہے، ان کے جنگوں میں نہ نکلنے پر کبھی سخت گیری نہیں کی بلکہ ان کے عذروں کو قبول کر لیتے۔ جیسا کہ اس جنگ میں بھی ہوا۔ مگر اب چونکہ وہ موقعہ پہنچ چکا تھا کہ منافقوں اور مومنوں کو الگ الگ کر دیا جائے اور زیادہ ان کے مسلمانوں میں ملا رہنے سے مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا تھا اس لیے اب حکم ہوتا ہے کہ کافروں اور منافقوں دونوں کے خلاف جہاد کرو۔ ظاہر ہے کہ یہاں جہاد سے مراد جہاد سیفی نہیں۔ کیونکہ منافقوں کے ساتھ کبھی جہاد سیفی نبی کریم ﷺ نے نہیں کیا۔ پس اس سے مراد دوسرا جہاد ہے جس کے معنی محض کوشش اور زور لگانے کے ہیں۔ یعنی اب ان کو اپنے میں سے نہ سمجھو اور ان کے خلاف پورا زور لگاؤ۔ اور دوسری بات فرمائی ﴿وَ اغۡلُظۡ عَلَیۡهِمۡ﴾ نبی کریم ﷺ کے غلیظ القلب ہونے کی تو قرآن کریم نے نفی کی ہے ﴿لَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِیۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ﴾ [آل عمران: 159:3] ''اگر تو سخت گو، سخت دل ہوتا تو تیرے پاس سے بھاگ جاتے۔'' معلوم ہوا نبی کریم ﷺ نہ

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۗ وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَ مَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَ اِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ مَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾

اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے نہیں کہا اور یقیناً انہوں نے کلمۂ کفر کہا اور اپنے (اظہارِ) اسلام کے بعد کافر ہو گئے اور ایسی چیز کا قصد کیا جس کو نہیں پا سکے[1322] اور وہ برا نہیں کہتے مگر اس لیے کہ اللہ نے اپنے فضل سے اور اس کے رسول نے ان کو غنی کر دیا۔[1323] سو اگر توبہ کریں تو ان کے لیے بہتر ہوگا اور اگر پھرے رہیں تو اللہ ان کو دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب دے گا اور زمین میں ان کا کوئی دوست نہ ہوگا اور نہ کوئی مددگار (ہوگا)۔[1324]

سخت کلامی کرنے والے تھے، نہ سخت دل تھے۔ پس جب قرآن شریف خود آپ کی یہ صفت بیان فرماتا ہے تو ﴿وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ نہ آپ کے لیے سخت گوئی کرنے کا حکم ہوسکتا ہے نہ سخت دلی اختیار کرنے کا۔ بلکہ مطلب صرف اس قدر ہے کہ تم جو اس قدر نرمی ان کے مقابلہ میں برتتے رہے ہو اگر یہ نرمی سے درست ہونے والے ہوتے تو ہو جاتے۔ اس لیے اب وہ چشم پوشیاں اور عفو اور درگزر جو ان کے قصوروں اور شرارتوں پر آپ کرتے رہے ہیں ان کو ترک کر کے ان کے مناسب حال شدت کا طریق اختیار کریں۔ کیونکہ دشمن کے مقابلہ میں نرمی اور درگزر سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے۔ جب وہ طریق عداوت کو نہیں چھوڑتے تو نرمی کا طریق اب ان کے مقابلہ میں کام نہیں دے سکتا۔

1322 - **منافقت کا نتیجہ ناکامی اور شیعوں پر اتمام حجت:** ﴿هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا﴾ منافقوں نے اسلام کو تباہ کرنے کا قصد کیا مگر اس مقصد کو حاصل نہ کر سکے۔ شیعہ جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو منافق کہتے ہیں قرآن کریم کے اس نص صریح کے خلاف کرتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن فیصلہ کرتا ہے کہ منافقوں کو ان کے ارادہ میں کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ مگر سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو وہ کامیابیاں اللہ تعالیٰ نے دیں اور ایسی ایسی نصرتیں ان کے ذریعہ سے اسلام کو عطا فرمائیں کہ بہت سے انبیاء علیہم السلام کو بھی وہ کامیابیاں حاصل نہیں ہوئیں۔

1323 - ﴿مَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ﴾ ایسا ہی ہے جیسا کوئی کہے [مَالِيْ عِنْدَكَ ذَنْبٌ اِلَّا اَنِّيْ اَحْسَنْتُ اِلَيْكَ] میں نے تیرا کوئی گناہ نہیں کیا سوائے اس کے کہ تیرے ساتھ احسان کیا۔ اللہ نے تو ان کو اپنے فضل سے غنی کر دیا۔ کیونکہ جو وسعت و غنا فتوحات کے بڑھنے کے ساتھ مسلمانوں کو ملے اس میں یہ منافق بھی شریک تھے۔ مگر نتیجہ اُلٹ ہوا کہ بجائے اس کے کہ نفاق کو چھوڑتے اور برا کہنا شروع کیا۔

1324 - دنیا کا عذاب الیم کوئی سزا ہے جو ان کو اس دنیا میں دی جائے۔ اس صورت میں صرف مسلمانوں سے ان کی تمیز کر دینا ہی ان

وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾

اور ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر وہ ہم کو اپنے فضل سے دے دے تو ہم ضرور صدقہ دیتے اور ہم ضرور نیکو کاروں میں سے ہوں گے۔

فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَ تَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾

پھر جب اس نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو اس میں بخل کیا اور پھر گئے اور وہ منہ پھیرنے والے ہیں۔ (1325)

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾

سو اس نے انہیں بدلہ دیا (کہ) ان کے دلوں میں نفاق (پیدا کر دیا) اس دن تک کہ وہ اس سے ملیں اس لیے کہ انہوں نے اللہ سے اس کے خلاف کیا جو اس سے وعدہ کیا تھا اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ (1326)

کے لیے عذاب الیم تھا اور جب یہ سزا ان کو ملی تو ان کا کوئی دوست و مددگار نہ بنا جو اس سزا کو ٹال دیتا۔

1325 - **ثعلبہ بن حاطب اور منافقوں سے زکوٰۃ کا نہ لیا جانا:** ثعلبہ بن حاطب ایک غریب آدمی تھا جس نے رسول اللہ ﷺ سے دعا کرائی کہ اس کے پاس مال بہت ہو تو وہ سب حقوق دے گا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ہی اس کا مال بڑھ گیا یہاں تک کہ اس نے نماز وغیرہ بھی ترک کر دی اور منافقانہ رویہ اختیار کیا اور جب نبی کریم ﷺ کے عامل اس کے پاس زکوٰۃ وصول کرنے گئے تو انکار کر دیا۔ پھر جب منافقین کو مسلمانوں کی جماعت سے الگ کر دیا گیا تو یہ شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا کہ اس کے مال میں سے زکوٰۃ لی جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اب نہیں لی جا سکتی۔'' آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد یہی ثعلبہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا کہ اس کے مال میں سے زکوٰۃ لی جائے آپ نے بھی انکار کر دیا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہی درخواست لے کر حاضر ہوا انہوں نے بھی انکار کر دیا۔ پھر اسی طرح سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی۔ یہ واقعہ اس آیت کے شان نزول میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر مراد اسی قدر ہے کہ اس پر اس آیت کا مضمون صادق آیا اور ہزاروں انسانوں پر بھی آتا ہے۔ بہتیرے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے دعائیں کر کر کے لیتے ہیں پھر حقوق مال ادا نہیں کرتے اور مال کو اپنا معبود بنا لیتے ہیں۔ ان لوگوں کی سزا قرآن کریم نے یہ بیان کی ہے کہ ان کے دلوں میں یہ نفاق پیدا ہو جاتا ہے۔ ہاں اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منافقوں کے ساتھ کیسا جہاد تھا کہ ان میں سے ایک شخص سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت تک زندہ رہتا ہے وہ مدینہ میں یا اس کے پاس موجود ہے مگر اس کی سزا سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اس سے زکوٰۃ نہیں لی جاتی۔

1326 - اس سے معلوم ہوا کہ نفاق کا ان کے دلوں میں پیدا ہونا خود ان کے پہلے اعمال کی سزا تھی کہ اللہ تعالیٰ سے عہد کر کے خلاف ورزی

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۷۸﴾

کیا ان کو معلوم نہیں کہ اللہ ان کے بھیدوں کو اور ان کے خفیہ مشوروں کو جانتا ہے اور کہ اللہ غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۫ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾

جو ان مومنوں پر طعن کرتے ہیں جو دل کھول کر صدقہ دیتے ہیں اور جو سوائے اپنی سخت مشقت کے کچھ نہیں پاتے تو ان پر ہنسی کرتے ہیں اللہ ان کو ہنسی کی سزا دے گا[1327] اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ

ان کے لیے بخشش مانگ یا ان کے لیے بخشش نہ مانگ۔ اگر تو ان کے لیے ستر مرتبہ بھی بخشش مانگے تو اللہ ان کو نہیں بخشے گا یہ اس لیے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کا انکار

کرتے رہے۔ ہر ایک خدائی مہر بطور سزا ہی لگتی ہے۔ اسی کے مطابق ہی جو منافق کی علامات میں لکھا ہے کہ [إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ] ''جب وہ وعدہ کرتا ہے تو خلاف ورزی کرتا ہے۔'' [وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ] (البخاری، کتاب الایمان، باب عَلاَمَةِ الْمُنَافِقِ، حدیث: 33) ''اور جب بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے۔'' جھوٹ بولنا اور وعدہ خلافی منافقت میں داخل ہیں۔

1327 - مُطَّوِّعْ اصل میں مُتَطَوِّعْ ہے ایسا شخص جو بطور تطوّع یا تبرع یعنی رضا و رغبت سے یا دل کھول کر دیتا ہے۔ (ن) ان پر منافق طعن کرتے کہ دکھاوے کے لیے بڑی بڑی رقوم دیتے ہیں۔

﴿لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ﴾ جَهْدٌ اور جُهْدٌ کے معنی مشقت ہیں۔ (غ) مراد غریب لوگ ہیں جو سخت محنتیں کرتے، مزدوری کرتے اور جو کماتے اس میں سے جو چند پیسے بچتے وہ لا کر خدا کی راہ میں حاضر کر دیتے۔ منافق ان پر ہنسی کرتے کہ بھلا ان کے مٹھی بھر دانوں کا بھی خدا محتاج ہے۔

﴿سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ﴾ کے معنی ہیں [جَازَاهُمْ عَلٰى سُخْرِيَّتِهِمْ] ان کی ہنسی کا ان کو بدلہ دے۔ جیسے ﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ﴾ [البقرة: 15:2] ''اللہ ان کو ذلیل کرے گا۔'' میں [دیکھو نمبر: 27]۔

رَسُوْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾ ع 10 8 16

کرتے ہیں اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔(1328)

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾

جو پیچھے چھوڑے گئے وہ اللہ کے رسول کے خلاف بیٹھ کر خوش ہوں گے اور ناپسند کیا کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ اور کہا گرمی میں مت نکلو۔ کہہ دوزخ کی آگ گرمی میں بہت بڑھ کر ہے۔ کاش یہ سمجھتے۔(1329)

1328- اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ منافقوں کی حالت ایسی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کسی صورت میں نہیں بخشے گا خواہ نبی ان کے لیے استغفار کرے یا نہ کرے۔ لیکن اس سے ممانعت استغفار نہیں نکلتی۔ اس لیے وہ حدیث صحیح اس آیت کے خلاف نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ **نبی ﷺ نے عبداللہ بن ابی راس رئیس المنافقین کا جنازہ پڑھا۔** بلکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو جنہوں نے اس آیت کے مضمون کی طرف توجہ دلا کر روکنا چاہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: [أَخِّرْ عَنِّي يَا عُمَرُ ... لَوْ أَعْلَمُ أَنِّي لَوْ زِدْتُ عَلَى السَّبْعِينَ يُغْفَرُ لَهُ لَزِدْتُ عَلَيْهَا.] (صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب مَا يُكْرَهُ مِنَ الصَّلاَةِ عَلَى الْمُنَافِقِينَ وَالاِسْتِغْفَارِ لِلْمُشْرِكِينَ، حديث: 1366) ''اے عمر ہٹ جا! اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ اگر میں ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کروں تو اسے بخش دیا جائے گا تو میں ضرور ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کرتا۔'' اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ستر کا لفظ نبی کریم ﷺ نے عدد کامل کے معنی میں ہی لیا اور اس سے یہ مراد نہیں لی کہ ستر سے زیادہ بار استغفار ہو تو اللہ تعالیٰ بخش دے گا بلکہ یہ تو آپ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا فرمایا ہے کہ استغفار کرو یا نہ کرو اللہ انہیں نہیں بخشے گا۔ اور اس سے پہلے سورۂ منافقون میں نازل ہو چکا تھا ﴿اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ [المنافقون: 6:63] ''تو ان کے لیے بخشش مانگے یا ان کے لیے بخشش نہ مانگے، اللہ انہیں نہیں بخشے گا۔'' جہاں ﴿سَبْعِيْنَ مَرَّةً﴾ مذکور نہیں۔ پس یہ آپ کا **استغفار اسی غلبۂ رحمت وشفقت سے تھا جس کی وجہ سے آپ رحمۃ اللعالمین کہلائے** کہ ایسی آیت کے ہوتے ہوئے راس رئیس المنافقین کی نماز جنازہ پڑھی۔ ہاں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ بھی ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مواعید کو بھی ٹال دیتا ہے۔ اسی بنا پر آپ ﷺ نے یہ دعا کی۔ لیکن جب ﴿لَا تُصَلِّ﴾ [التوبة: 84:9] ''نماز کبھی نہ پڑھنا۔'' کا حکم صریح آ گیا تب آپ رک گئے۔ اگلا رکوع منافقوں سے قطع تعلق پر ہے۔

1329- الْمُخَلَّفُوْنَ۔ خَلَّفْتُهُ کے معنی ہیں میں نے اسے چھوڑا۔ پس مُخَلَّفُوْنَ وہ ہیں جو پیچھے چھوڑے گئے اس لیے کہ انہوں نے جھوٹے

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّ لْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾

سو تھوڑا ہنسیں اور بہت روئیں۔ اس کی سزا جو وہ کماتے تھے۔ (1330)

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

پس اگر اللہ تجھے ان میں سے کسی گروہ کی طرف لوٹا کر لائے اور وہ نکلنے کے لیے تجھ سے اجازت مانگیں تو کہہ دے میرے ساتھ کبھی نہ نکلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے جنگ کرو گے تم پہلی مرتبہ بیٹھنے پر راضی ہو گئے۔ سو اب پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ (1331)

عذر بنا کر اجازت حاصل کر لی تھی۔

خِلَفَ۔ خَالَفَ سے مصدر ہے اور اس کے معنی مخالفت ہیں۔ (غ۔ج) یعنی رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں یا مخالفت کی خاطر خوش ہوئے اور بعض نے خِلَفَ کے معنی بعد بھی کیے ہیں مگر پہلے معنی قابل ترجیح ہیں۔

1330 - مطلب یہ ہے کہ یہ تو رسول اللہ ﷺ کی اس مخالفت سے خوش ہو رہے ہیں۔ حالانکہ ان کو چاہیے کہ اپنی اس حالت پر بہت روئیں اور تھوڑا ہنسیں۔ یعنی ان کی ایسی حالت کہ برے کام پر خوش ہو رہے ہیں رونے کے قابل ہے، خوشی کا مقام نہیں۔ اور ضَحِكٌ اور بُكَاءٌ سے خوشی اور غم مراد ہیں۔ یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ خوش تو ہو رہے ہیں مگر ان کی خوشی بہت تھوڑے دن ہے اور آخر کار رونا یا غم ہی ہوگا۔

1331 - ﴿فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ﴾ کیونکہ یہ وحی اس حالت میں ہوئی، جب آپ سفر تبوک پر تھے۔

خٰلِفِيْنَ۔ خَالَفَ کی جمع ہے، جس کے معنی پیچھے رہنے والا۔ نقصان یا قصور کی وجہ سے جیسے مُتَخَلِّفٌ اور خَالِفَةٌ خیمہ کے پچھلے ستون کو کہتے ہیں اور کنایۃً عورت کو اس لیے کہ وہ کوچ کرنے والوں سے پیچھے رہ جاتی ہے۔ اور اس کی جمع خَوَالِفِ ہے۔ (غ) جس کا استعمال [آیت: 87] میں ہوا ہے۔

یہ ان منافقوں سے جو توبہ نہ کریں اور دین اسلام میں سچے دل سے داخل نہ ہوں **تعلقات ظاہری کا انقطاع ہے** کہ آئندہ ان کو کسی جنگ میں نکلنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔

وَ لَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾

اور تو ان میں سے کسی پر جو مر جائے نماز (جنازہ) کبھی نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑا ہونا کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور وہ مر گئے اس حالت میں کہ وہ نافرمان تھے۔ (1332)

وَ لَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

اور ان کے مال اور اُن کی اولاد تجھے تعجب میں نہ ڈالیں۔ اللہ یہی ارادہ کرتا ہے کہ ان کی وجہ سے ان کو دنیا میں عذاب دے اور ان کی جانیں نکل جائیں اور وہ کافر ہوں۔

وَ اِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ جَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَ قَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾

اور جب کوئی سورت اتاری جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ ہو کر جہاد کرو تو ان میں سے فراخی والے تجھ سے اجازت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں چھوڑ ہم بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ رہ جائیں گے۔

1332 - یہ **انقطاع تعلقات روحانی** ہے کہ آپ کو ان کے جنازے سے بھی روک دیا گیا۔ کیونکہ ان کی عداوت اب حد سے بڑھ گئی تھی اور اخفا کی حالت سے نکل چکی تھی۔ ﴿لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ﴾ سے مراد قبر پر دعا کے لیے کھڑے ہونا ہے۔ اس آیت کا نزول عبداللہ بن ابی کے جنازہ کے واقعہ کے بعد کا ہے اور یہ متعدد احادیث سے جو بخاری اور دیگر صحاح میں ہیں ثابت ہے۔ چونکہ حضرت عمرؓ عبداللہ بن ابی کا جنازہ پڑھنے کو ناپسند کرتے تھے اس لیے یہ ان مواقع میں سے ایک ہے جن پر حضرت عمرؓ کی رائے کا وحی الٰہی سے توافق ہوا۔ یہاں سے ہی یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ **وحی نبی کریم ﷺ کے اپنے خیالات کا نتیجہ نہ تھی**۔ کیونکہ آپ کی شفقت تو جبلی تھی۔ ﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ کے ارشاد نے بھی آپکو دعائے مغفرت کرنے سے نہ روکا۔ اللہ تعالیٰ بخشے یا نہ بخشے یہ اس کا اختیار رہا۔ آپ نے اپنی شفقت جبلی سے اور رحمت وسیع سے دعائے مغفرت بھی کی اور اپنی قمیص بطور تبرک عطا کر دی۔ اب اس کے خلاف وحی ہونا صاف بتاتا ہے کہ یہ آپ کی رائے اور خیالات سے الگ کوئی امر تھا۔

رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَ طُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾

وہ اس بات پر راضی ہوگئے کہ عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اوران کے دلوں پر مہر لگا دی گئی سو وہ سمجھتے نہیں۔

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾

لیکن رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرتے ہیں اور انہی کے لیے (سب) بھلائیاں ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾ ع 11 9 17

اللہ نے ان کے لیے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، انہی میں رہیں گے یہ بڑی بھاری کامیابی ہے۔

وَ جَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَ قَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾

اور دیہاتیوں میں سے بہانے کرنے والے آئے کہ انہیں اجازت دی جائے اور جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا وہ بیٹھے رہے جو ان میں سے کفر پر رہے انہیں دردناک دکھ پہنچے گا۔(1333)

1333 - مُعَذِّرُوْنَ - لسان العرب میں ہے کہ مُعتَذِر سچا بھی ہوتا ہے اور جھوٹا بھی۔ یعنی محض عذر کرنے والا خواہ وہ عذر درست ہو یا غلط اور عَذَّرَ کے معنی قَصَّرَ ہیں یعنی کوتاہی کی اور مُعَذِّر وہ ہے جو عذر پیش کرے اور اس کا عذر درست نہ ہو۔ یعنی جھوٹا عذر بنانے والا یا بہانہ کرنے والا۔ الْاَعْرَابِ - اصل میں عَرَبْ کی جمع ہے مگر یہ ان لوگوں کے لیے خاص ہوگیا ہے جو بادیہ کے رہنے والے ہوں۔ (غ) ہمارے ہاں اس کے مقابل پر دیہاتی کا لفظ ہے یعنی گاؤں کے رہنے والے لوگ۔

اس رکوع میں بالخصوص ان لوگوں کا ذکر ہے جو بادیہ کے رہنے والے تھے اور جن میں ایسے بھی لوگ تھے جو منافقانہ طور پر اسلام کا دعویٰ کرتے تھے اور ایسے بھی تھے جو سچے دل سے مسلمان تھے جیسا کہ [آیت نمبر: 99] سے ظاہر ہے۔ مجاہد کہتے ہیں یہاں جن کا ذکر ہے وہ بنی غفار کا ایک گروہ تھا ﴿وَ قَعَدَ الَّذِيْنَ﴾ میں اسی گروہ کا ذکر ہے اور ﴿كَذَبُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ﴾ میں ان کے جھوٹے عذروں کا ذکر ہے۔ یعنی یہ لوگ جھوٹے عذر کرکے جنگ سے پیچھے رہ گئے۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَى الْمَرْضٰى وَ لَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾

نہ کمزوروں پر کوئی گناہ ہے اور نہ بیماروں پر اور نہ ان پر جو خرچ کرنے کو کچھ نہیں پاتے جب وہ اللہ اور اس کے رسول سے اخلاص رکھیں، نیکی کرنے والوں پر (الزام کی) کی کوئی راہ نہیں، اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (1334)

وَّ لَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۖ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ ؕ

اور نہ ان پر (الزام ہے) کہ جب وہ تیرے پاس آئے کہ تو انہیں سواری دے تو نے کہا مجھے کچھ نہیں ملتا جس پر تمہیں سوار کروں وہ واپس چلے گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اس غم سے کہ وہ (مال) نہیں پاتے جسے خرچ کریں۔ (1335)

1334 - نَصَحُوْا ۔ [نَصَحَ الشَّیْءَ] کے معنی ہیں خَلَصَ یعنی خالص ہوئی اور نُصِحِ غِشّ یعنی کھوٹ کی ضد ہے۔ (ل) اور حدیث میں ہے [الدِّينُ النَّصِيحَةُ لِلّٰهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِكِتَابِهِ وَلأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ] (صحيح البخاری، الإيمان، باب قول النبي ﷺ الدين النصيحة...) یعنی **دین نصیحت ہے** اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور اس کی کتاب کے لیے اور مسلمانوں کے آئمہ کے لیے اور ان عام لوگوں کے لیے۔ جس کی شرح ابن اثیر نے یوں کی ہے کہ نَصِيحَةٌ سے مراد ارادۂ خیر ہے اس کے لیے جو منصوح ہے یعنی جس پر وہ فعل نصیحت واقع ہوتا ہے۔ پس اللہ کے لیے نصیحت اس کی وحدانیت کا اعتقاد اور اس کی عبادت میں اخلاص اور رسول کے لیے نصیحت اس کی نبوت اور رسالت کی تصدیق اور جو امر یا نہی وہ دے اس کی فرمانبرداری ہے اور کتاب اللہ کے لیے نصیحت کتاب پر عمل اور آئمہ کے لیے نصیحت ان کی اطاعت فی المعروف اور عوام کے لیے نصیحت ان کو اچھی باتوں کی طرف ہدایت کرنا ہے اور ﴿تَوْبَةً نَّصُوْحًا﴾ [التحريم: 8:66] کے معنی ہیں خالص توبہ جس کے بعد اس بات کی طرف لوٹ کر نہ جائے جس سے توبہ کی ہے۔ (ل)

جب پچھلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر کیا جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے جھوٹے عذر کر کے اجازت لے لی تھی کہ وہ جنگ میں نہ جائیں تو اب اس آیت اور اس سے اگلی آیت میں **ان لوگوں کا ذکر کیا جو فی الحقیقت معذور تھے**۔ اس میں تین گروہوں کا ذکر کیا ① کمزور جیسے بچے بوڑھے، ② بیمار، ③ وہ لوگ جن کے پاس خرچ کرنے کو موجود نہیں۔ ایسے لوگ جہاد سیف میں معذور ہیں۔

1335 - لِتَحْمِلَهُمْ ۔ حَمَلَ کا لفظ اٹھانے کے معنی میں بہت سے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی۔ گناہ کے

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَ هُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

الزام صرف ان پر ہے جو تجھ سے اجازت مانگتے ہیں حالانکہ وہ دولت مند ہیں۔ راضی ہو گئے کہ عورتوں کے ساتھ رہیں اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی سو وہ نہیں جانتے۔

اٹھانے پر بھی استعمال ہوا ہے۔ مگر یہاں جس خاص موقع پر استعمال ہوا ہے اس کی تشریح میں لسان العرب میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنے سفر کو جاری نہ رکھ سکے تو وہ دوسرے کے پاس جاتا اور کہتا ہے اِحْمِلْنِیْ تو مراد ہوتی ہے کہ مجھے سواری کا جانور دو۔

﴿تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ﴾ فَاضَ پانی کے بہنے پر بولا جاتا ہے جب وہ گر رہا ہو اسی معنی میں یہاں تَفِيْضُ ہے اور دوسری جگہ ہے ﴿اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ﴾ [الأعراف: 50:7] ''ہم پر کچھ پانی بہاؤ'' اور اسی سے فَيَّاضٌ سخی کو کہا جاتا ہے اور اسی سے [اَفَاضُوْا فِي الْحَدِيْثِ] استعارۃً بات میں لگ جانے کے معنی میں ہے ﴿لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ﴾ [النور: 14:24] ''جس بات کا تم نے اس میں چرچا کیا تھا۔''

یہ ان لوگوں میں سے جو اس جنگ میں جانے میں فی الواقع معذور تھے چوتھا گروہ ہے۔ کسی نے کہا یہ بنو مقرن تھے جو مزینہ میں سے تھے۔ کسی نے کہا عرباض بن ساریہ کا ذکر ہے۔ کسی نے کہا مختلف قبیلوں کے سات آدمی تھے۔ (ج) کسی نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور بعض اہل یمن کو اس کا مصداق ٹھہرایا۔ (ر) ممکن ہے یہ سب ہی ہوں تخصیص کی ضرورت نہیں۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ ہر موقع پر اس کے مناسب حال انتظام نہ ہونے سے انسان معذور ہوتا ہے۔ چونکہ یہ لمبا سفر تھا بغیر سواری کے نہ پہنچا جا سکتا تھا اس لیے سواری کا نہ ملنا بھی صحیح عذر تھا۔

لیکن جو نقشہ یہاں ان معذورین کا کھینچا ہے وہ صحابہ کے قلب کی کیفیت کا ایک عجیب نقشہ ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جن کے پاس خرچ کرنے کو ہے وہ خوشی سے اللہ کی راہ میں دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب خرچ کرنے کو نہیں پایا اور رسول اللہ ﷺ بھی سواری مہیا نہ فرما سکے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جذبہ محبت جو رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری کراتا تھا کس قدر زبردست تھا۔ آج مسلمانوں کی انفاق مال میں یہ حالت ہے کہ اول تو اسلام کی حالت زار دیکھ کر اسے چاروں طرف سے مصیبتوں میں مبتلا پا کر بھی ان کے دل دینے کے لیے نہیں پگھلتے اور اس قدر دل سخت کر لیتے ہیں کہ ایک پیسہ تک جیب سے نہیں نکلتا اور جو کچھ دیتے ہیں تو وہ بھی ایک گونہ جبر و اکراہ سے۔ دل نہیں چاہتا مگر لحاظ سے یا اور وجوہ سے کچھ دینا پڑتا ہے۔ اسلام اس مقام کو چاہتا ہے کہ جو دے اس کا دل خوشی سے بھرا ہوا ہو کہ اس نے کچھ خدمت کی اور جو نہ دے سکے اس لیے کہ اس کے پاس نہیں اس کا دل غم سے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی ہوں۔